اُردو زبان کا فروغ: جہات اور امکانات

سمینار میں پڑھے گئے مقالات

مرتب

اشفاق احمد عارفی

اُردو افسر

محکمۂ السنہ

اُردو سیل

قومی راجدھانی خطہ دلّی سرکار

www.taemeernews.com

اُردو زبان کا فروغ: جہات اور امکانات

(سمینار میں پڑھے گئے مقالات)

مرتب

اشفاق احمد عارفی

اُردو افسر

محکمۂ السنہ

اُردو سیل

قومی راجدھانی خطہ دلّی سرکار

ساتویں منزل، سی-ونگ، دلّی سکریٹریٹ، آئی. پی. اسٹیٹ، نئی دلّی-110002

www.taemeernews.com

جملہ حقوق محفوظ : محکمۂ السنہ، اُردو سیل، قومی راجدھانی خطہ دلّی سرکار

کتاب : اُردو زبان کا فروغ: جہات اور امکانات
مرتب : اشفاق احمد عارفی (اُردو افسر)
ناشر : محکمہ السنہ، اُردو سیل
قومی راجدھانی خطہ دلّی سرکار
پتہ : ساتویں منزل، بی ونگ- دلّی سکریٹریٹ
آئی-پی-اسٹیٹ، نئی دلّی-110002 فون نمبر:23392348
کمپیوز کمپوزنگ : محمد احمد
سالِ اشاعت : 2004
تعداد : 500
مطبع : شوبی آفسیٹ پریس، گلی گڑھیا، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دلّی-2

© Language Department, Urdu Cell
Govt. of NCT of Delhi

URDU ZABAN KA FAROGH: JIHAT AUR IMKANAT
(Articles presented in Seminar)

Compiled by:
A. A. Arfi
(Urdu Officer)

Edition : 2004

Language Department, Urdu Cell
7th Level "C" wing, Delhi Secretariat
I.P. Estate, New Delhi-110002 Ph: 23392348

www.taemeernews.com

فہرست

☆ پیش لفظ

☆ اردو زبان اور تعلیم — عبداللہ ولی بخش قادری 9

☆ ابتدائی اور ثانوی سطح تک اردو تدریس... — معین الدین 14

☆ دلّی میں اردو تعلیم و تدریس کی صورتِ حال — پروفیسر صادق 23

☆ تدریس بامداد کمپیوٹر اور اردو زبان کا فروغ — مزمل حسین قاسمی 28

☆ سرکاری سرپرستی میں اردو زبان کا فروغ:... — سید شریف الحسن نقوی 46

☆ اردو لغات اور فرہنگ سازی کے مسائل — ڈاکٹر جمیل اختر 59

☆ اردو زبان کا سیکولر کردار — ڈاکٹر انوار احمد خاں 71

☆ عوامی اظہار، ادبی اظہار: مماثلت و افتراق — ڈاکٹر مولا بخش 81

☆ اردو کے فروغ میں نشریاتی ادب کا حصہ — شکیل اختر 95

☆ اردو زبان کے فروغ میں ڈرامے کا کردار — انیس اعظمی 108

☆ اردو زبان، تشکیلی عناصر اور سماجی سروکار — ڈاکٹر مشتاق صدف 116

☆ پرفارمنگ آرٹ اور اردو — ڈاکٹر محمد کاظم 122

☆ اردو زبان کے فروغ میں اوپن اسکولنگ... — ڈاکٹر شعیب رضا خاں 132

☆ فاصلاتی تعلیم اور اردو — ڈاکٹر ریاض احمد 138

☆ اردو سیل کی سرگرمیاں 145

☆ اطلاع نامہ "دلّی سرکاری زبان قانون۔2000" 147

☆ "دلّی سرکاری زبان قانون 2000" کے نفاذ کا اطلاع نامہ 150

☆ آئین ہند میں درج اقلیتوں کے مفادات سے متعلق دفعات 151

www.taemeernews.com

پیش لفظ

ہندوستان جیسے کثیر تہذیبی اور کثیر لسانی ملک میں الگ الگ ریاستوں اور علاقوں میں بولی جانے والی مختلف زبانیں اپنی اپنی مخصوص سماجی اور تہذیبی شناخت اور امتیاز رکھتی ہیں۔ان میں لسانی خصایص کی بنا پر اور وسیع تر عوامی سروکار کی وجہ سے اردو کو اقلیتی زبان ہونے کے باوجود علاقائی زبان نہیں کہا جاسکتا۔ اپنی نحوی اور صرفی ساخت اور صوتی خصوصیات، اسما، افعال اور ذخیرۂ الفاظ کی سطح پر بھی اردو کو ہندوستان گیر پیمانہ پر رابطہ کی بنیادی زبان ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اسما کی سطح پر عربی اور فارسی لغات اور الفاظ سے بھرپور استفادہ کے باوجود اردو کا نظام افعال یکسر ہندوستانی ہے۔ اسی طرح ضمائر، تعداد، جنس اور حالت وغیرہ بھی اس کی ہندوستانی بنیادوں کو مستحکم کرتے ہیں۔ ہندوستانی زبانوں کی لسانی بنیاد کے واقف کار اِس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ ایک بولی اور سمجھی جانے والی زبان کے طور پر اردو زبان ہمیشہ زندہ رہنے کی صلاحیت سے بھرپور ہے۔ صوتی حسن، تخلیقی قوت اور اظہار و بیان کی روانی اور برجستگی مذکورہ خصوصیات پر حسنِ مستزاد کا درجہ رکھتی ہیں۔

زبان کے فروغ اور ترویج و اشاعت کے تین بنیادی مراحل ہوسکتے ہیں، اول تدریس دوسرا تصنیف و تالیف بہ شمول تحقیق اور تیسرا مرحلہ روزمرہ کی عملی زندگی میں اس کا استعمال۔ جہاں تک اردو زبان کی تدریس کی بات ہے، حالیہ برسوں میں روایتی طریقۂ تدریس کے متوازی مختلف افراد اور اداروں کے ذریعہ اِس سمت میں بہت سی خاطر خواہ اور مفید کوششیں ہوئی ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اردو زبان کی تعلیم و تدریس کے سلسلے میں یہ بات شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے کہ اردو کی تدریس، تدریسِ زبان کے سلسلہ میں جدید تحقیقات کی روشنی میں سامنے آنے والے نئے اصول و نظریات اور تبدیل شدہ طریقوں کے مطابق ہونی چاہیے۔ اِس ضمن میں زبان کی تحریری اور تقریری صلاحیت سے بہرہ ور ہونے کے لیے قلیل مدتی اور مفید نصاب تعلیم آج کی بڑی ضرورت ہے جو دلچسپ اور معلومات افزا ہونے کے ساتھ ساتھ نفسیاتی اور ذہنی سطح پر قابل قبول بھی ہو، تاکہ طلبا دوسری زبانوں اور علوم کے ساتھ ساتھ اردو بھی اُسی دلچسپی سے مناسب مدت میں سیکھ سکیں۔ جب ہم فلم، ریڈیو، ٹی.وی، اخبارات، اشتہارات اور میڈیا کے حوالے سے ترسیل و ابلاغ کی مقبول، رائج اور موثر زبان کی بات کرتے ہیں تو اس وقت عام طور پر اردو زبان کی مقبولیت کے احساسِ تفاخر سے دوچار ہوتے ہیں۔ یہ بات سچ اور درست بھی ہے کہ ہندوستان میں عوامی ذرائع ابلاغ کا عمومی ڈکشن اردو زبان کا ڈکشن ہے یا اس کے ہم آہنگ اور قریب ترین ہے۔ اس اعتبار سے اردو، ایک بولی اور سمجھی جانے والی زبان کی حیثیت سے لسانی اور جذباتی اظہار کا مقبول ترین وسیلہ اور میڈیم ہے۔ لیکن عملی سطح پر اور لسانیاتی نقطۂ نظر سے کسی زبان کی بقا کا کوئی تصور اُس کے اپنے مخصوص رسم خط

www.taemeernews.com

سے الگ کر کے نہیں کیا جا سکتا۔ اکیسویں صدی میں اردو بولنے والی نئی نسل جس رفتار سے اردو رسم خط سے ناواقف ہوتی جا رہی ہے یہ اردو کی تحریک سے وابستہ اداروں اور افراد کے لیے ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ شہروں، گلی محلوں کی مسجدوں اور دوسری عبادت گاہوں میں ''بات نہ کرنے'' ''خاموشی برتنے'' اور ''نماز کے وقت موبائل فون بند رکھنے'' جیسے جملوں کی دیوناگری میں لگی تختیوں کو دیکھ کر یہ احساس اور بھی شدید ہو جاتا ہے۔ اس صورتِ حال کے تدارک کے لیے جہاں اسکولوں، کالجوں اور دیگر روایتی تعلیمی اداروں میں اردو تدریس کا باضابطہ نظم اور ماحول قائم کرنے کی ضرورت ہے وہیں مختلف اکادمیوں، غیر سرکاری اداروں اور تنظیموں اور افراد کو انفرادی اور اجتماعی سطح پر اردو کی تعلیم و تدریس کے سلسلہ میں بھی سنجیدہ ہونا ضروری ہے۔ نئے تقاضوں کے مطابق ہندی، اردو اور دیگر زبانوں کے ذریعہ اردو رسم خط سکھانے کے لیے یونی ورسٹیوں، اکادمیوں، اداروں اور افراد کے ذریعہ قابل قدر کوششیں کی جا رہی ہیں، کچھ مذاکرے اور ورک شاپ بھی ہوئے ہیں جس سے مستقبل میں اچھی امیدیں قائم کی جا سکتی ہیں۔ اسی سلسلے میں دلّی سرکار کے محکمۂ السنہ، اردو سیل کی اردو تربیتی اسکیم کے تحت سرکاری محکموں/دفاتر میں اردو زبان میں سرکاری امور کی انجام دہی کا ماحول پیدا کرنے کے مقصد کے تحت سرکاری افسران اور عملوں کے لیے چار ماہ کے اردو سرٹیفکیٹ کورس اور چھ ماہ کے ایڈوانس اردو کورس اور اردو جاننے والے افسران و عملوں کی اردو زبان سے دلچسپی اور وابستگی برقرار رکھنے کے لیے اردو ورک شاپ، ریفریشر کورس، اردو مضمون نویسی اور خوش نویسی کے مقابلے بھی منعقد کیے جاتے ہیں۔ ان میں شریک ہونے والے افسران اور عملوں کو سند، نقد انعامات، مومنٹو، قابلِ مطالعہ کتابیں اور لغات بھی فراہم کی جاتی ہیں۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ اردو زبان سیکھنے کے خواہش مند سرکاری افسران اور عملوں کی تعداد میں سال بہ سال اضافہ ہو رہا ہے۔ روزمرہ اور عملی زندگی میں اردو زبان کے استعمال کے لیے اردو کو جدید ترین ضروریات اور نت نئے تقاضوں سے قریب اور ہم آہنگ کرنا بھی ضروری ہے جو لسانی سطح پر ہونے والی جدید سائنسی اور تکنیکی ایجادات اور ترقیات سے واقفیت اور اُن پر دسترس کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ کمپیوٹر ٹکنالوجی، فاصلاتی طریقۂ تعلیم، اوپن اسکولنگ سسٹم، نشریاتی ادب اور پرفارمنگ آرٹ کے شعبوں سے اردو کو ہم آہنگ کر کے عوامی سطح پر زیادہ سے زیادہ مقبول اور ہر دلعزیز بنایا جا سکتا ہے۔ اردو کے سرکاری، نیم سرکاری، خود مختار ادارے اور تنظیمیں اس میدان میں متحرک کردار انجام دے سکتے ہیں۔ اردو میں سائنسی اور تکنیکی متون اور انتظامی امور سے متعلق فرہنگ کی دستیابی اور فراہمی ہنوز توجہ طلب ہے۔ اگرچہ یہ کام ایک مقتدرہ ادارے کا ہے لیکن بدلے ہوئے لسانی منظرنامے اور تقاضوں کی روشنی میں ذاتی اور شخصی سطح پر بھی اس جانب کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی ہے۔ ماضی میں فرہنگ پیشہ وران (مولوی ظفر الرحمٰن دہلوی) اور ڈپٹی نذیر احمد کی ''تعذیراتِ ہند'' کے رتبے کی کوشش تو کجا، انگریزی اور ہندی

www.taemeernews.com

میں آسانی کے ساتھ دستیاب انتظامی اصطلاحات بھی اردو میں منتقل نہیں کی جاسکی ہیں۔ اِکا دُکا اگر کچھ ہوا بھی تو اِس کی حیثیت ذخیرۂ کتب کی زینت میں اضافے سے زیادہ نہیں۔ ایک عام خیال کے مطابق اردو میں تکنیکی اور انتظامی اصطلاحات کو اکثر و بیشتر جوں کا توں اختیار کر لینے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ لیکن کسی زبان کی ہمہ جہت ترویج و اشاعت اور سرمایہ داری کا معاملہ اِس طرح حل نہیں کیا جاسکتا، ہمیں اپنی کوشش تو کرنی ہی چاہیے۔ ایسے الفاظ اور ایسی اصطلاحیں جو عام اور روزمرہ زندگی میں داخل ہو چکی ہیں اور آسانی کے ساتھ سمجھی جاتی ہیں، انھیں من و عن قبول کر لینا تو درست ہے، لیکن ایسی اصطلاحیں جن کا متبادل آسانی کے ساتھ متعین کیا جاسکتا ہے اور جو صوتی آہنگ کے اعتبار سے بھی قابلِ قبول ہوں انھیں ضرور رائج کیا جانا چاہیے۔ اسی طرح ہندوستان کے مخصوص سماجی، سیاسی اور لسانی پس منظر میں بعض اصطلاح کے انگریزی متبادل کی بجائے ہندی متبادل بھی قبول کیے جاسکتے ہیں۔ اردو زبان کا بنیادی لسانی مزاج اِس کی پوری آزادی فراہم کرتا ہے، اِس طرزِ عمل سے ہندی اور اردو کے درمیان لسانی ہم آہنگی اور یکجہتی کی بنیاد بھی مستحکم ہوگی۔

ہندوستان جیسے کثیر لسانی ملک میں جہاں ایک سروے کے مطابق 1652 زبانیں بولی جاتی ہیں ان میں 1455 زبانیں ایسی ہیں جن کے بولنے والوں کی تعداد دس ہزار سے بھی کم ہے یعنی 197 زبانیں ایسی ہیں جو زیادہ بولی جاتی ہیں، اُن میں بھی آئین کے آٹھویں فہرست بند (شیڈول) میں صرف اٹھارہ زبانوں کو شامل کیا گیا۔ شیڈول زبانوں میں اردو کا کردار بالکل منفرد ہے۔ کوئی مخصوص جغرافیائی علاقہ نہیں، دھرم نہیں صوبہ نہیں۔ یہ پورے ملک کی مشترکہ تہذیب اور عوامی سطح پر سماج کے ہر فرد کے اجتماعی حافظے اور شعور کی زبان ہے۔ ہندوستانی (اردو۔ ہندی) محاوروں، روزمرہ اور کہاوتوں، ضرب الامثال کے مطالعہ سے اس حقیقت کو تقویت ملتی ہے۔

اردو لغات اور فرہنگ کے سلسلے میں عام طور پر بات قدیم ترتیب کی بار بار اشاعت سے آگے نہیں بڑھتی جبکہ کسی بھی زبان کی قوت اور مقبولیت کا اندازہ اس کے ذخیرۂ الفاظ سے کیا جاسکتا ہے۔ دنیا کی ہر بڑی اور ترقی پذیر زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ہندوستان جیسے کثیر لسانی اور کثیر ثقافتی ملک میں ایک جامع قومی اردو لغت تیار کرنے کی ضرورت ہے جس میں اردو میں اپنائے گئے ہندوستان کی تمام زبانوں اور علاقوں کے الفاظ شامل ہوں۔ اسی طرح اردو میں کثیر لسانی لغت، صوتی لغت، لغتِ تلفظ، لغتِ محاورہ، روزمرہ اور ضرب الامثال اور ایک جامع اردو تھیسارس کی تیاری بھی ضروری ہے۔

اردو اِملا کا مسئلہ بھی کسی حد تک ہنوز توجہ طلب ہے۔ اِس ضمن میں جو کوششیں ہوئیں بھی وہ عام نہیں ہوسکیں۔ جب خود اردو اِملا کے مسائل حل طلب ہیں تو ایسی صورت میں اردو الفاظ اور مرکبات کے دیوناگری املا کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے۔ اردو میں ہمزہ اور کسرہ دونوں سے

www.taemeernews.com

بننے والے مرکباتِ اضافی و توصیفی کا دیوناگری اِملا ایک ہی طرح لکھنے کا چلن ہے جبکہ کسرہ سے بننے والے مرکبات اضافی و توصیفی کا دیوناگری اِملا مکسور حرف پر ''ए'' کی ماترا (े) اور اُس کے بعد ترکیب کا نشان (-) دے کر اور ہمزہ والے مرکبات کا اِملا ہمزہ والے حرف کی جگہ ''ए'' پر اوّل و آخر ترکیب کے نشان (-ए-) کے ساتھ لکھنا زیادہ درست محسوس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر دردِ دل کو दर्दे-दिल اور دیدۂ تر کو दीदा-ए-तर لکھا جاسکتا ہے۔ ہندوستان میں درست تلفظ اور صحیح املوں کے ساتھ اردو زبان کی نشر و اشاعت کے مسائل سے وابستہ افراد اور ایجنسیوں کے لیے اس قسم کے امور کی جانب بھی توجہ مبذول کرنا لازمی ہے۔

اردو زبان کی ترویج و اشاعت اور اس کے مشترکہ تہذیبی و ثقافتی کردار کے فروغ و تشہیر کے لیے قومی راجدھانی خطہ دلّی سرکار کے محکمۂ السنہ، اردو سیل کی جانب سے گزشتہ سال 26 اور 27 / اپریل 2003 کو ''اردو زبان کا فروغ: جہات اور امکانات'' کے موضوع پر منعقد کیے گئے دو روزہ سمینار اور سمپوزیم کے دائرۂ موضوعات کو علوم و فنون کے اُن گوشوں تک وسعت دینا ضروری تصور کیا گیا جن کا تعلق زبان کے تدریسی، عصری اور علمی پہلو سے زیادہ سے زیادہ تر ہو تا کہ علمی سطح پر قومی اور سماجی زندگی کے مختلف شعبوں میں اردو زبان کی قبولیت (Acceptance) اور ترقی کے لیے گفت و شنید کے ذریعہ ایک دانشورانہ ماحول قائم کیا جا سکے۔ سمینار میں مقالات کی پیش کش اور اظہارِ خیال کے لیے علوم و فنون کے مختلف شعبوں سے متعلق ماہرین اور دانشوروں کو زحمت دی گئی جنھوں نے اپنے بیش بہا تجربات اور مفید آرا اور معلومات سے نوازا۔ اس ضمن میں منصوبہ بند طور پر اردو زبان سے وابستہ نئی نسل اور طلبا برادری کو بھی بھرپور نمائندگی دی گئی اور ان سے تاثرات بھی مدعو کیے گئے، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی ایجنسی، ادارہ یا تنظیم اردو زبان کی تعلیم و تدریس اور نشر و اشاعت کے لیے نئی نسل کو ساتھ لے کر عوامی سطح پر کوئی کام کرنا چاہے تو اسے خاطر خواہ کامیابی مل سکتی ہے۔

سمینار میں پیش کیے گئے مقالات محکمہ السنہ، اردو سیل کی جانب سے کتابی شکل میں شائع کیے جا رہے ہیں تا کہ اس کے مندرجات میں شامل حقائق اور آرا سے استفادہ کیا جا سکے۔ آخر میں حکومت دلّی کے'' سرکاری زبان قانون-2000 '' 26 / جنوری 2004 سے تمام سرکاری اور ماتحت محکموں / دفاتر میں اِس قانون کے نفاذ کا اطلاع نامہ، محکمۂ السنہ، اردو سیل کی سرگرمیاں اور آئین ہند میں درج لسانی اقلیتوں سے متعلق دفعات بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔ جن سے اُردو زبان سے متعلق نکات اور سہولیات کی واقفیت حاصل کی جاسکتی ہے۔

اشفاق احمد عارفی

اردو افسر

www.taemeernews.com

عبداللہ ولی بخش قادری

اُردو زبان اور تعلیم

ہمارے دورِ آزادی کی نصف صدی میں نہ صرف سرکاری زبان کی اجارہ داری نے اُردو کی راہ میں خلل اندازی کی ہے بلکہ اُس کی راہیں تک مسدود کرنے سے ہاتھ نہیں روکا گیا ہے۔ مزید برآں قہر درویش بہ جانِ درویش کے مصداق نادانی اور نادان دوستی نے بھی اُس کے ساتھ تن آسانی کا انداز اختیار کرلیا۔ متعلقین اور معاونین دونوں اپنے فرائضِ منصبی کی طرف سے بے نیاز ہوکر سہل کاری، نمائشی کارروائی میں سرگرداں ہوگئے۔ لہٰذا اُردو کی بساط نہ صرف سکڑتی جارہی ہے بلکہ بگڑتی اور اُکھڑتی بھی جارہی ہے۔

مادری زبان ذہنی ترقی اور دل داری کرتی ہے۔ غیر زبان بہرکیف غیریت کا پہلو اور اجنبیت رکھتی ہے۔ وہ مزاج داں اور ہم مذاق بھی نہیں ہوتی ہے اور دلداری کے آداب سے شناسائی بھی نہیں رکھتی۔ لہٰذا مادری زبان کی اوّلیت کو برقرار رکھتے ہوئے دیگر زبانوں کی واقفیت میں کوئی تکلف نہیں ہے۔ لیکن مادری زبان کی اوّلیت اور فوقیت کو نظر انداز کرنا بے جا ہے (خواہ وہ گھر سے باہر نہ نکلے) حالات پر قدرت نہ ہو تاہم یہ ضروری ہے کہ مدرسے میں لازمی تعلیم کا آغاز کرنے سے قبل ہی نجی طور پر اندرونِ خانہ مادری زبان کا آغاز ہو چکا ہو۔ حکومتِ وقت کی لازمی تعلیم کے باوصف مادری زبان کا حق ادا کیا جائے اور اُس کا فیض اٹھایا جائے۔ تازہ معلومات یہ ہے کہ بچہ شکمِ مادر میں ماں کی آواز پہچاننے لگتا ہے اور اپنا ردِعمل بھی کرتا ہے۔ کیا یہ

www.taemeernews.com

دریافت ہمیں کچھ فیضِ علم کی طرف کوئی نئی روشنی دکھانے کا آغاز تو نہیں ہے؟ بہرکیف ہمیں یہ یاد رہنا چاہیے کہ فرد کی مادری زبان صرف ایک ہی ہوتی ہے اور وہ بدل بھی نہیں سکتی ہے۔

اُردو زبان ایک جدید ہندآریائی زبان ہے جو دہلی اور اس کے نواح میں پیدا ہوئی۔ وہ ایک مخلوط زبان ہے جس میں مختلف زبانوں کے الفاظ نیز اطوار و آداب داخل ہوتے رہے ہیں جیسے عربی، فارسی، پُرتگالی، تلگو، تامل، گجراتی، پنجابی اور انگریزی۔ ان سب میں بہ وجوہ انگریزی کی پذیرائی بڑھ چڑھ کر رہی ہے۔ فرانسیسی و جرمن نیز دیگر زبانوں سے بھی شناسائی رکھتی ہے۔ اسی زبان نے ''اُردو ہے جس کا نام'' ہندوستان کی جنگِ آزادی میں ''انقلاب زندہ باد'' کا نعرہ دیا، جو حصولِ آزادی میں زبان زدِ خاص و عام ہوا، اور جس نے ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' ترانے سے اہلِ وطن کے دلوں کو وقارِ وطن کے ادراک و احساس سے گرمایا اور سارے عالم کو جتایا کہ ''دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے''۔ مگر! حصولِ آزادی کی تگ ودو میں تنگ دلی کی ہوا کچھ ایسی چلی کہ اُردو جیسی مقبول اور صلحِ کل زبان کو حکومتِ وقت کے اقدام نے اُس کے منصب سے ہٹا دیا، وہ قومی زبان کے وقار سے محروم کردی گئی اور لازمی تعلیم کے دائرے میں اس کو داخل نہیں کیا گیا نیز زبان دانی کی صالح و روایات کو انحرافات قرار دیا گیا۔ لہٰذا اب بیان کرتے ہیں کہ 'تعلیم کیا ہے'؟ تاکہ 'زبان' کا مقام اور مادری زبان کی اہمیت عیاں ہوجائے۔

ایک ماں اپنی بچی کو سلائی مشین چلانے میں مدد کر رہی ہے، گویا اسے ٹھیک طور پر مشین چلانا سکھا رہی ہے۔ ایک باپ اپنے بچے کو لکھنا سکھاتا ہے، ایک ہم جماعت اپنے ساتھی کو کسی لفظ کے معنی بتاتا ہے۔ یہ سب رہنمایانہ امور تدریس کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مزید برآں تدریس کا فن صرف دوسروں کی رہنمائی اور ہمت افزائی ہی نہیں کرتا بلکہ وہ سکھانے والے کو بھی سکھاتا ہے۔ وہ اس کی مہارت اور استعداد میں اضافے کا بھی موجب ہوتا ہے۔ پچھلے تجربے سے مستفید ہونا ہماری بڑی سعادت اور سرمایہ ہے۔ اگرچہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جن اسباب کی بنا پر مناسب اور پسندیدہ عمل کرتے ہیں اسی طور پر ناپسندیدہ اور نامناسب بھی اختیار کرسکتے ہیں۔

تعلیم کے چند مقبولِ عام مفہوم:

(۱) وہ تعلیم جس کا مرکز کتاب ہے (کتابی تعلیم)

(۲) وہ تعلیم جس کا مرکز بچہ ہے۔ (طفل مرکز تعلیم)

www.taemeernews.com

(۳) وہ تعلیم جس کا مرکز زندگی ہے۔ (حیات مرکز تعلیم)
(۴) تعلیم ایک فعال اور متحرک عمل ہے۔ تعلیم ایسی چیز نہیں ہے جسے بطور خیرات پیش کیا جا سکے۔
(۵) تعلیم بحیثیت ماحصل، جماعتی تہذیب، تسلیم شدہ اقدار کی نشوونما۔
(۶) تعلیم تقریباً اتنی ہی پرانی ہے، جتنی نسلِ انسانی پرانی ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت ایک نمایاں وصف ہے جس نے ادنیٰ درجے کے حیوانات سے اُسے ممیز کیا ہے۔

رسمی اور غیر رسمی تعلیم:

غیر رسمی تعلیم میں تبدیلی لانے والے وہ تمام اثرات شامل ہیں جن کے تحت ایک شخص کو زندگی بھر رہنا پڑتا ہے جب کہ رسمی تعلیم اس طرف اشارہ کرتی ہے جو گھر، گرجا، یا مدرسہ جیسے بعض تعلیم دینے والے اداروں کے ذریعے شعوری طور پر عمل میں لایا جاتا ہے۔

غیر رسمی تعلیم جیسی بھی ہے اچھی ہے لیکن اس کے بعض حدود ہیں، اولاً تو وہ غیر منظم ہے۔ جن تجربات کو وہ پیش کرتی ہے اُن کا انحصار اتفاق پر ہوتا ہے۔ یہ تجربات منظم نہیں ہوتے اور کسی منطقی ترتیب یا تاریخی تسلسل کے تحت پیش نہیں کیے جاتے لہٰذا جو علم پہنچانا ہوتا ہے اس کے اندر بہت سی خامیاں باقی رہ جاتی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ تجربے سے سیکھنا فضول، خطرناک اور مہنگا ثابت ہوسکتا ہے۔ بعض باتیں ذاتی تجربے سے سیکھی جاسکتی ہیں لیکن بیشتر باتوں کو نسلِ انسانی کے اجتماعی حلقے سے سیکھنا پڑتا ہے۔

دوسری طرف رسمی تعلیم میں بعض یقینی فائدے ہیں۔ یہ غیر منظم نہیں ہے۔ اس سے ہمارے علم میں خلا باقی نہیں رہتا۔ اُس کے تحت اُن تمام تجربات کا انتخاب کیا جاتا ہے جن کو نسلِ انسانی نے سودمند سمجھا ہے اور ان تجربات کو بچے کے سامنے منظم اور مرتب انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔

تعلیم کے وسائل:

(۱) گھر: ابتدائی عہد میں انسان کے پاس تعلیم کے خصوصی ادارے نہیں تھے۔ اس عہد میں ساری تعلیم غیر رسمی تھی، بچے اپنے بزرگوں کی نقل کرتے اور ان کی نصیحتوں کے ذریعے سیکھتے تھے۔ لڑکے اپنے باپ کی نقل کرتے تھے اور شکاری اور سورما بن جاتے تھے، لڑکیاں اپنی ماں کی نقل کرتی تھیں اور گھریلو ذمہ داریوں کو سیکھ لیتی تھیں۔ جب کوئی تہذیب خانہ بدوشی کو ترک کردیتی اور آبادی بسا لیتی تب اُس برادری کے لیے ممکن ہوتا کہ وہ اپنے بچوں کے لیے سماجی ورثے کی ترسیل کے لیے نئے وسائل فراہم کرسکے۔ گھر میں بطور تعلیمی وسیلہ کچھ

www.taemeernews.com

خوبیاں بھی رکھتی ہیں اور کچھ نقائص بھی۔ ایک اچھا گھر گردوپیش کی تہذیب سے بچے کو ہم آہنگ کرتا ہے، اچھی عادات واخلاق، محبت اور تحفظ کا ماحول پیدا کرتا ہے۔ لیکن برا گھر بدحالی اور بداعمالی کا باعث ہوتا ہے۔

(۲): مندر اور گلڈ (ہم پیشہ لوگوں کی انجمن یا برادری) پُروہت طبقہ سیکولر عملی علم کے بجائے روحانی عقائد سے دلچسپی رکھتا ہے اور زندگی کے تجارتی پہلوؤں کو سنبھالنے کے لیے دست کاروں کی انجمن وجود میں آئیں جو گلڈ کہلاتی ہیں۔

(۳) مدرسہ: تعلیم کا اہم وسیلہ: سقراط (Socrates) پانچویں صدی قبل مسیح میں تھا۔ اس کی سب سے بڑی دین ہے کہ اس نے بنی نوع انسان کو وضاحتِ خیال میں سہارا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ سوفطائی (Sophists) بہت سی چیزوں کو جاننے کا جھوٹا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس لیے وہ ان کی اعلمی کے گھروندے کو بگاڑنے اور ان کی غلطیوں اور تضاد کو ظاہر کرنے پر کمربستہ ہوگیا۔ اس نے جو طریقہ اپنایا اس کو سقراطی یا جدلیاتی (Dialectic) طریقہ کہا جاتا ہے۔ اس طریقے کی رو سے وہ چند معصوم قسم کے سوالات کی بنا پر ایک ایسے شخص کو جو علم کا مدعی ہو کوئی بیان دینے پر راغب کرلیتا تھا۔ جیسے ہی اس شخص نے بیان دے دیا وہ اپنے شکار سے مزید سوال کرتا تھا۔ آخرکار وہ شخص تناقص بالذات میں مبتلا ہوجاتا تھا یا اپنی بے علمی کا اظہار کردیتا تھا۔ اس انداز سے اس نے لوگوں کو یہ سکھایا کہ حقیقت کسی انفرادی رائے کا نام نہیں بلکہ ایک ایسی چیز ہے جس میں عالم گیر صحت ہوتی ہے۔

افلاطون (Plato) سقراط کا شاگرد تھا۔ اس کی کتاب 'ریاست' عالم گیر شہرت کی مالک ہے۔ 'ریاست' تعلیم اور مملکت دونوں کا احاطہ کرتی ہے۔ افلاطون جب ایتھنز کے اندر اپنی مشہور اکادمی میں طلبہ کو درس دیتا تھا اس کے بے انتہا ذہین نوجوان شاگردوں میں ایک ارسطو (Aristotle) بھی تھا۔ تعلیم پر اس کے تصورات اس کی دو کتابوں 'اخلاقیات' اور 'سیاسیات' میں درج ہیں۔ 'اخلاقیات' میں سوال اٹھاتا ہے کہ وجود کا مقصد کیا ہے؟ اور خود جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ 'مسرت' ہے۔ مسرت کیا ہے؟ وہ سوال کرتا ہے اور یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ صرف 'حواس' ہی مسرت نہیں بلکہ اُس سے زیادہ گہری اور زیادہ پائیدار چیز ہے۔ اس کے نزدیک 'مسرت' اعتدال پسند زندگی گزارنے سے ملتی ہے۔ اس کی رائے میں عقل مہارت سے اسفل ہیجان پر غلبہ پانا، خیر کی طرف لے جانا ہے اور فلسفیوں کی گیان دھیان کی زندگی میں اعلیٰ ترین خیر پائی جاتی ہے۔

www.taemeernews.com

تہذیب اور تعلیم : تہذیب اور تعلیم کا قریبی تعلق ہے۔ ایک لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تہذیب 'دخترِ تعلیم' ہے کیونکہ کسی تہذیب کا وجود انسانی تجربے کی لگاتار ترقی کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ علم کو بہ مدارج حاصل کرنا اور ایک نسل سے دوسری نسل کو پہنچانا چاہیے۔ اگر ہمیں تہذیب کو قائم اور شاداب رکھنا ہے تو علم میں وسعت اور ترقی ہونا چاہیے۔ اس طرح تعلیم کی حیثیت بنیادی ہے جو تہذیب کی بالائی عمارت کی پشت پناہی کرتی ہے۔

●●●

www.taemeernews.com

معین الدین

ابتدائی اور ثانوی سطح تک
اُردو تدریس کے رجحانات

منتظمین سمینار کی جانب سے مضمون لکھنے کے لیے مجھے جو عنوان تجویز کیا گیا ہے وہ ہے ''ابتدائی اور ثانوی سطح تک اُردو تدریس کے رجحانات''۔ ابتدائی اور ثانوی سطح تک اردو کی تدریس ایک وسیع موضوع ہے جس کا احاطہ ایک مضمون میں مشکل ہے۔ زیادہ بہتر ہوتا اگر مدرسہ کی سطح پر کسی ایک پہلو پر اظہارِ خیال کیا جاتا تو اس کا حق ادا ہوسکتا تھا اور اس سے خاطر خواہ استفادہ بھی کیا جاسکتا تھا۔

اُردو کی تدریس کے طور وطریق پر اظہارِ خیال کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں پہلے عرض کردوں کہ زبان کی تدریس کے سلسلے میں پہلے جو تصورات رائج تھے وہ آج کے تصورات سے یکسر مختلف تھے۔ پہلے زبان کی تعلیم مقصود بالذات تصور کی جاتی تھی یعنی زبان سکھانا ہی زبان کی تعلیم کا مقصد ہوتا تھا لیکن اب یہ تصور باقی نہیں رہا۔ اب زبان کا ایک نشو ونمائی تصور ہے جس کے تحت سمجھا جاتا ہے کہ زبان ترسیل خیال کا ایک اہم وسیلہ ہے اور زبان اور فکر کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس کے ذریعے انسان کے شعور کی تربیت ہوتی ہے اور تہذیب پروان چڑھتی ہے۔ زبان کے وسیلے سے ہی انسان گردوپیش کے ٹھوس حقائق کو تصورات کے پیکر میں ڈھالتا ہے اور تخیلات کی دنیا آباد کرتا ہے۔ اس کے ذریعہ کبھی تجزیاتی فکر کی داغ بیل پڑتی ہے

www.taemeernews.com

اور کبھی تخلیقی فکر کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ فکر کی نشوونما سے ذہنی نشوونما کا گہرا تعلق ہے۔ زبان فرد اور سماج کے درمیان فعال رشتہ پیدا کرنے کا ایک اہم وسیلہ ہے اور بحیثیت مجموعی شخصیت سازی کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

مدرسے کی تمام تر تعلیم دراصل زبان کی ہی تعلیم ہے یعنی اگر زبان کی تعلیم ناقص ہو تو دیگر مضامین کی تعلیم بھی ناقص ہو جاتی ہے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو زبان کی تعلیم مدرسے کی زندگی کی ایک لازمی شرط ہے۔

تعلیم میں زبان کی اہمیت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ یہ ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ پہلے ہماری تدریس ''مضمون مرکز'' تھی اور اب ''طفل مرکز'' ہے۔

اس پس منظر میں اُردو کی تدریس کے مقاصد کا تعین کرتے وقت بچوں کی نفسیات، نصاب، اور طریقۂ تعلیم سے متعلق جو جدید تصورات سامنے آئے ہیں انھیں بھی پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔

ابتدائی سطح پر اُردو کی تدریس کے طور وطریق پر غور کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ پہلے تدریس اُردو کے مقاصد کا تعین کرلیا جائے۔ بنیادی طور پر اس منزل پر تدریس اُردو کے چار مقاصد متعین کیے جاسکتے ہیں:

۱۔ بولنا سکھانا

۲۔ پڑھنا سکھانا

۳۔ لکھنا سکھانا

۴۔ سمجھنا سکھانا

جہاں تک پہلے مقصد کا تعلق ہے اس کا آغاز تو بچے کے گھر سے ہو چکا ہوتا ہے اس لیے کہ بچہ جب اسکول آتا ہے تو بولتا ہوا آتا ہے بلکہ بعض والدین کو تو یہ شکایت ہوتی ہے کہ طوطی کی طرح چہکتا ہوا بچہ اسکول میں آکر گونگا ہو جاتا ہے۔

بولنا سکھانا ایک ایسا کام ہے جو قبل مدرسہ شروع ہو جاتا ہے اور پوری زندگی جاری رہتا ہے اس میں برابر نشوونما ہوتی رہتی ہے۔ مدرسے کا کام یہ ہے کہ بچے کی گفتگو کو شائستہ اور شستہ بنائے اور اس کی زبان میں اتنی وسعت پیدا کرے کہ بچہ ضرورت کے لحاظ سے موثر گفتگو کر سکے اور بول کر اپنے احساسات، جذبات اور خیالات کو موثر طور پر بیان کر سکے۔ مدرسے کے اندر، تدریس کی ہر منزل پر بولنے کا عمل جاری رہتا ہے۔ کبھی بات چیت کے انداز میں، کبھی سوال وجواب

www.taemeernews.com

کے پیرائے میں اور کبھی اظہارِ خیال کی صورت میں گویائی کا عمل جاری رہتا ہے اور مختلف صورتوں میں اس کی مشق ہوتی رہتی ہے۔

پڑھنا سکھانا تدریس زبان کا ایک اہم مرحلہ ہے۔ پڑھنے کے عمل کو عام بول چال میں ''پڑھائی'' کہتے ہیں لیکن اصطلاحی معنوں میں اس کے لیے اُردو میں کہیں قرأت، کہیں خواندگی اور کہیں مطالعہ کہا گیا ہے۔ اس مضمون میں پڑھائی کے عمل کے لحاظ سے لفظ مطالعہ کا استعمال کیا گیا ہے۔

تدریس زبان کے کچھ بنیادی اصول ہیں جن کی پابندی سے زبان سکھانے میں مدد ملتی ہے۔ ان میں سے کچھ کر کے سیکھنے کا اصول ایک بہتر اور کامیاب اصول تسلیم کیا جاتا ہے۔ تدریسی عمل کے دوران اس اصول کا بار بار اعادہ بھی کیا جاتا ہے لیکن عملاً اس کو نظر انداز بھی کیا جارہا ہے۔ لہٰذا جب بھی تعلیمی دستور میں اصلاح کی جانب کوئی قدم اٹھایا جائے تو اس کا ذکر ناگزیر ہو جاتا ہے۔

کچھ کر کے سیکھنے کا اصول اس لحاظ سے بہتر تصور کیا جاتا ہے کہ اس کے ذریعے آموزگار میں فعالیت پیدا ہوتی ہے، آموزگار خود پیش قدمی کرتا ہے اور عمل آموزش میں دلچسپی پیدا ہونے لگتی ہے اور دلچسپی کے بغیر کچھ بھی سیکھا نہیں جاسکتا۔ کچھ کر کے سیکھنے کا اصول، اصول جاننے سے بہتر ہے۔ محض اصول جاننے سے عملی طور پر استفادہ نہیں کیا جاسکتا۔ بولنا، بولنے سے پڑھنا، پڑھنے سے لکھنا اور لکھنے سے ہی سیکھا جاسکتا ہے۔

کچھ کر کے سیکھنے کے اصول کے ساتھ ساتھ اصولِ مشق بھی ایک اہم اصول ہے۔ اس لیے کہ مشقیں سیکھے ہوئے علم کو پائیدار بناتی ہیں اور اگر مشقیں تعلیمی اور نفسیاتی تقاضوں کے پیش نظر تیار کی گئی ہوں تو یقیناً آموزگار کے لیے محرک ثابت ہوں گی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آموزشی عمل اور اصولِ مشق کو اس طرح ہم آہنگ کیا جائے کہ اس میں آموزگار کے لیے معنویت پیدا ہو جائے اور تدریسی عمل خشک اور بے جان نہ رہے۔ ان مشقوں کے ذریعے بولنے، پڑھنے اور لکھنے کی بنیادی مہارتیں سیکھی جاسکتی ہیں۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ مقرون اشیا کی مدد سے زبان سکھائی جائے اور آموزگار میں ان اشیا کی مدد سے مجرد تصورات پیدا کرائے جائیں۔ اس سلسلے میں تصویروں، خاکوں، ذاتی مشاہدوں اور تجربوں کو بنیاد بنایا جائے تو آموزش زیادہ پائیدار ثابت ہوگی۔

www.taemeernews.com

چوتھا اصول مرکزیت کا ہے۔ زبان پڑھاتے وقت ہر منزل پر توجہ زبان پر ہی مرکوز رہنی چاہیے یعنی بولنے، پڑھنے اور لکھنے کے عمل میں زبان اور زبان کے بہتر استعمال کو مرکزیت دینی چاہیے۔

پانچواں اصول اجتماعیت کا ہے لیکن اس اصول کو برتتے وقت انفرادیت کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ اجتماعیت کے پیشِ نظر آموزگار میں آپسی میل جول، لین دین، باہم بات چیت اور بحث مباحثے کے مواقع فراہم کرنے چاہییں۔

ہماری تعلیم بیک وقت انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی لہٰذا دونوں پہلوؤں سے آموزگار میں لسانی نشوونما کے مواقع فراہم کرنے چاہییں۔

ابتدائی سطح پر زبان کی بنیادی مہارتوں کا سیکھنا ایک دشوار اور طویل عمل ہے۔ اس لیے کہ اس کے اندر لیے وقوفی صد لاحیتوں کو گسٹالٹ نظریے پر مبنی تفاعل درکار ہوتے ہیں چنانچہ پڑھنا سیکھنے کے لیے آموزگار کو زبان سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ زبان، کوڈنگ اور ''ڈی کوڈنگ'' کے ایک نظام پر مشتمل ہوتی ہے۔ فنِ تعلیم سے متعلق تحقیقی مطالعوں سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ مطالعے میں کامیابی اسی وقت ہوتی ہے جب آموزگار زبانی اظہار کے طور پر زبان کا استعمال کر چکا ہوتا ہے اور چھپے ہوئے الفاظ کو سمجھ بوجھ کر پڑھنے کی صلاحیت پیدا کر چکا ہوتا ہے۔ اس تحقیق کے نتائج کی روشنی میں حروف تہجی پر مبنی تدریس سے جو پرائمری درجات میں عام طور پر جاری ہے، آموزگاروں کی ہمت شکنی ہوتی ہے اور وہ مطالعے کے دوران سمجھ بوجھ کر پڑھنے کی کوشش سے محروم رہ جاتے ہیں اور جب بار بار ایسا ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ پڑھتے ہیں اس کے مفہوم سے بیگانہ ہوتے ہیں تو ان میں اعتمادِ نفس کی کمی ہو جاتی ہے اور وہ اسکول چھوڑ بھاگتے ہیں۔ تعلیمی اصطلاح میں اس کو بھگوڑا پن کہتے ہیں اور اس کا اثر جو پورے تعلیمی نظام پر پڑتا ہے۔ اصطلاحی زبان میں یہ تضیع (Waste) کہلاتا ہے۔

بھگوڑے بچوں کے علاوہ جو بچے اپنی تعلیم جاری رکھتے ہیں اور پڑھنا سیکھ لیتے ہیں، ان میں بھی عام طور پر مطالعے کی کوئی اچھی عادت نہیں پیدا ہوتی بلکہ وہ محض ایک میکانکی مطالعہ کنندہ بن جاتے ہیں میکانکی مطالعہ کنندہ سے مراد ہے ایسے بچے جو متن کو محض رٹ کر یاد لیتے ہیں اور اس کے مفہوم سے نابلد رہ جاتے ہیں۔ مشقی اسباق کے دوران اکثر ایسا اتفاق ہوا ہے کہ میکانکی طریقے سے پڑھنے والے یا رٹ کر پڑھنے والے فرفر متن سنا دیتے ہیں لیکن دراصل وہ سمجھ کر

www.taemeernews.com

پڑھ نہیں سکتے۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر آموزگار میں اچھے مطالعے کی عادت پیدا کرائی جائے تو ان میں مطالعے کی تحریک پیدا ہو سکتی ہے اور تعلیم میں مزید تضیع کا عمل رُک سکتا ہے۔

ابتدائی منزل پر تدریس زبان ایک کلیدی مرحلے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے کہ زبان کی تعلیم نہ صرف آموزش کا ذریعہ ہے بلکہ اس کے ذریعے آموزگار کے مشاہدات اور تجربات میں معنویت پیدا ہو سکتی ہے۔

ثانوی سطح:

ثانوی سطح پر اُردو کی تدریس اس اعتبار سے مزید اہمیت رکھتی ہے کہ ثانوی منزل بیشتر طلبا کے لیے اختتامی منزل ثابت ہوتی ہے یعنی اس منزل کے اختتام پر بیشتر طالب علم اپنی تعلیم ترک کر دیتے ہیں اور وہ زندگی میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس لیے انھیں زبان پر اتنا عبور تو ہونا ہی چاہیے کہ وہ اپنی نجی یا کاروباری زندگی میں زبان کا عملی استعمال کر سکیں۔ لہٰذا اس منزل پر زبان کا نصاب تیار کرتے وقت جہاں اس بات کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا کہ اگلی منزل کی تعلیم کے کیا تقاضے ہیں وہیں اُن طلبا کے نجی تقاضوں کا بھی پاس رکھنا ہوگا جن کی یہ اختتامی منزل ہے۔

ثانوی سطح پر ان تمام صلاحیتوں، مہارتوں، دلچسپیوں اور رویوں کو جاری رکھنا ہوگا جو پرائمری سطح پر سیکھے گئے ہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ ان کے دائرۂ عمل میں توسیع بھی کرنی ہوگی۔ پھر یہ بھی غور طلب ہے کہ ثانوی سطح پر اگر اُردو ذریعہ تعلیم ہے تو دوسرے مضامین سے اس کو مربوط کرنا ہوگا۔ گویا نصاب کو بیک وقت اُفقی اور عمودی بنانا ہوگا تاکہ اگلی جماعتوں کے نصاب کے ساتھ ساتھ اس جماعت کے مختلف مضامین سے بھی ربط پیدا کیا جا سکے۔

اسی طرح تدریس کے دوران اسباق کی نوعیت کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ نوعیت کے اعتبار سے اسباق کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔

۱۔ معلوماتی سبق (Knowledge Lesson)

۲۔ مہارتی سبق (Skill Lesson)

۳۔ ذوقی سبق (Appreciation Lesson)

نثر کے تمام اسباق، معلوماتی اسباق کی فہرست میں آتے ہیں اور نظم کے تمام اسبق، ذوقی

www.taemeernews.com

اسباق میں شمار کیے جاتے ہیں۔ مضمون نویسی، مکتوب نویسی، اختصار نویسی اور تشریح وغیرہ مہارتی سبق سمجھے جاتے ہیں۔

نثر کے اسباق ہر چند کہ معلوماتی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ان میں مہارتیں سیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے مثلاً تلفظ، بلند خوانی (مطالعہ) اور خاموش خوانی (خاموش مطالعہ) کی مہارتیں۔

اسی طرح نظم کے اسباق میں بھی بلند خوانی کے اوصاف پیدا کرنے کے لیے مہارتیں سیکھنے کی ضرورت ہوگی۔

انشا کے کام میں تو سارا زور تحریری مہارتیں سکھانے پر ہی ہوگا۔

خاموش مطالعہ:

جیسا پہلے عرض کیا جا چکا ہے ابتدائی منزل پر تمام تر توجہ زبان کی آموزش پر ہوگی۔ زبان کا مواد دو طرح کا ہوتا ہے: لسانی مواد اور تصوراتی مواد۔ لسانی مواد کے تحت تلفظ، اخذ معنی اور قواعد پر زور دیا جائے گا اور تصوراتی مواد کے تحت سبق کی نوعیت پر غور کرنا ہوگا۔ یعنی مضمون کس قسم کا ہے۔ معلوماتی ہے، سائنسی ہے یا ادبی۔ ثانوی منزل پر زبان کے ساتھ ساتھ چونکہ ادب کی تدریس شروع ہو جاتی ہے لہٰذا لسانی اور تصوراتی مواد کی بھی نوعیت بدل جاتی ہے لسانی اور تصوراتی مواد کے تقاضوں کے پیش نظر طریقۂ تدریس میں تنوع پیدا کرنے کی ضرورت ہے، کہیں پر زور مہارتوں کی تدریس پر ہوگا تو کہیں پر تفہیم و تحسین پر نثر کے اسباق میں تفہیم کا مسئلہ بہت اہم ہے، بہتر تفہیم کا انحصار ایک موثر خاموش مطالعے پر ہے۔ خاموش مطالعے کے عام طور پر دو مقاصد بتائے جاتے ہیں ایک زود خوانی اور دوسرا مطلب فہمی۔ مطلب فہمی کا انحصار زود خوانی پر ہے یعنی اگر تیز رفتار کے ساتھ پڑھنے کی مہارت پیدا ہو جائے تو مفہوم اخذ کرنے میں سہولت پیدا ہو جائے گی۔

خاموش مطالعے کے دوران آموزگار ایک نفسیاتی مرحلے سے دو چار ہوتا ہے جو اپنی افادیت کے لحاظ سے بہت ہی معنی خیز ہے۔ یہاں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ بچہ مطالعہ کس طرح کرتا ہے۔ آموزگار کے عمل مطالعہ سے ہی طریقۂ تدریس کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔

بچہ پڑھنا اس وقت شروع کرتا ہے جب وہ بول کر اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ زبان کے صوتی نظام سے واقف ہو چکا ہوتا ہے اور اس کے ذخیرۂ

www.taemeernews.com

الفاظ میں خاطر خواہ اضافہ ہو چکا ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس میں اتنی لسانی مہارت ہو چکی ہوتی ہے کہ وہ بالغوں کی آپسی گفتگو اور بات چیت کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ دراصل بولے ہوئے الفاظ سمعی علامت ہیں اور لکھے ہوئے الفاظ علامتوں کی علامت ہیں۔ مطالعے کے دوران بچے کو بصری علامتوں کی شناخت کرنی ہوتی ہے۔ شناخت کے اس عمل میں ایک بھرپور نفسیاتی مرحلہ درپیش ہوتا ہے جس کو مختصراً یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

مطالعہ کرتے وقت بظاہر ایسا لگتا ہے جیسے نگاہ بیک وقت ساری سطر یا عبارت سے گزر جاتی ہے۔ لیکن ایسا ہوتا نہیں بلکہ نظر مواد تحریر کے ساتھ ساتھ حرکت کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد کسی مقام پر ٹھہر جاتی ہے اسی وقفے میں الفاظ پڑھ لیے جاتے ہیں۔ یہ سکون، وقفہ کہلاتا ہے۔ اس وقفے میں الفاظ اور حروف کی پوری شناخت کی جاتی ہے اور ان کے مفاہیم واضح ہونے لگتے ہیں۔ گویا اسی وقفے میں پڑھا اور پڑھ کر سمجھا جاتا ہے۔

وقفے کے بعد آنکھیں پھر حرکت کرتی ہیں اور نگاہ کسی مقام پر توقف کر جاتی ہے۔ اس طرح ایک وقفے سے دوسرے وقفے تک آنکھیں یعنی نگاہ آگے بڑھتی ہے لیکن سست رفتاری کے ساتھ نہیں آگے بڑھتی بلکہ حسیت کرتی ہے۔ گویا ہر دو وقفوں کے درمیان ایک حسیت ہوتی ہے اور ہر وقفے پر حسیت میں آئے ہوئے الفاظ کو پڑھا اور سمجھا جاتا ہے۔ اگر مطالعے کی رفتار معتدل ہے تو آنکھیں حسیت اور وقفہ کرتی ہوئی سطر کو عبور کر جاتی ہیں لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ رفتار معتدل نہیں رہتی۔ قاری اپنا مقام کھو بیٹھتا ہے یا مفہوم کے مرحلے پر گھبرا جاتا ہے اور نگاہ مفہوم سمجھنے کے لیے پیچھے کو حرکت کرتی ہے۔ پیچھے کی یہ حرکت، رجف کہلاتی ہے۔ اس طرح پڑھنے کے عمل میں حسیت، وقفہ اور رجف تینوں عمل ہوتے ہیں۔ ایک وقفے میں آنکھیں جتنی دیر ٹھہرتی ہیں وہ مدت وقفہ کہلاتی ہیں اور ایک وقفے میں جتنے حروف آنکھیں دیکھتی ہیں اسے مواد وقفہ اور یہ مواد جتنی چوڑائی میں ہوتا ہے اسے عرصۂ مطالعہ کہتے ہیں اور ایک عرصۂ مطالعہ میں الفاظ کی جتنی اکائیاں بنتی ہیں وہ ایک وحدہ کہلاتی ہیں۔ عرصۂ مطالعہ جتنا طویل ہوگا اتنا ہی زیادہ بامعنی اور معنی خیز وحدہ ہوگا اور عبارت بخوبی سمجھ میں آجائے گی۔ وقفے کی مدت جتنی کم ہوگی، مطالعہ اور تفہیم کا عمل اسی قدر تیز ہوگا۔ خاموش مطالعہ اور تفہیم میں جو باہم رشتہ ہے اس کی وضاحت اس لیے بھی ضروری ہے کہ خاموش مطالعہ میں زود خوانی کی اہمیت واضح کی جاسکے تاکہ تفہیم کا عمل بہتر طور پر سمجھا جاسکے۔

www.taemeernews.com

نظم کی تدریس کے دوران بھی تفہیم کا عمل ہوتا ہے لیکن تحسین کے دوران ہی اس کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ شعر کی تشریح میں اگر تحسین کا پہلو نہ ظاہر ہو تو سمجھنا چاہیے کہ تفہیم کا عمل تشنہ رہ گیا۔

غزل میں چونکہ اسلوب بیان رمزیہ اور علامتی ہوتا ہے اس لیے استحسان شعر نظم کے مقابلے میں کسی قدر دشوار عمل ہے اور استاد سے زیادہ بصارت اور بصیرت کا مطالعہ کرتا ہے لیکن اس کی تدریس میں عام طور پر ایک روایتی طریقہ اپنایا جاتا ہے جس کی رو سے استاد شعر کی نثر کراتا ہے اور پھر مطلب سمجھاتا ہے۔ حالانکہ مصرعوں کی نثر کرانا تضیع اوقات ہے اور لطف اندوزی کے عمل میں مانع بھی ہے۔

نظم و نثر کی تدریس کے بعد ثانوی منزل پر انشا کی تدریس کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ اس کے ذریعے شاگردوں کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کا زیادہ سے زیادہ موقع ملتا ہے۔ اس لحاظ سے اس منزل پر انشا کے کام کی بڑی اہمیت ہے لیکن انشاء کی تعلیم کے سلسلے میں ایک غلط رجحان یہ نظر آتا ہے کہ انشا کے کام کو محض درسی کتاب کی مشقوں تک محدود کر دیا جاتا ہے اور دوسرے رجحان کے تحت انشا کے کام کو محض مضمون نگاری سمجھ لیا جاتا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ انشا کے مشاغل کو مشقی انشا اور تخلیقی انشاء میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ دونوں کا حق ادا ہو سکے۔

تحریری انشا کا بہت گہرا تعلق تقریری انشا سے ہے۔ قبل اس کے کہ بچہ کچھ لکھے اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ مضمون نویسی میں موضوع سے طلبا کی دلچسپی بہت ضروری ہے۔ ثانوی منزل پر انشا کی تدریس میں موضوع کا انتخاب بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ مضمون نویسی میں موضوع سے طلبا کی دلچسپی ضروری ہے۔ موضوع دلچسپ ہے تو انشا کا کام بھی دلچسپ ہوگا۔ موضوع کے انتخاب میں طلبا کا اشتراک ضروری ہے۔ موضوع کے انتخاب کے بعد موضوع سے متعلق زبانی اظہارِ خیال کرانا چاہیے۔ اس کے بعد طلبا کے اشتراک سے مضمون کا خاکہ تیار کرانا چاہیے اور پھر مضمون نویسی کا کام کرانا چاہیے۔ مضمون نویسی کے دوران تخلیقی انشا پر خاطر خواہ زور دینے کی ضرورت ہے۔

اندازۂ قدر:

استاد کی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ذمے داری یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً طلبا کی تعلیمی ترقی کا جائزہ لیتا رہے اور اندازۂ قدر کے تحت مواد مضمون کی جانچ کے ساتھ ساتھ وقوفی پہلوؤں یعنی

www.taemeernews.com

احساسی اور عملی پہلوؤں کا بھی اندازہ لگاتا رہے تاکہ اس کو یہ اندازہ ہو سکے کہ آموزگار کی تعلیمی ترقی کا کون سا پہلو کمزور ہے اور کس معاملے میں پچھڑا ہوا ہے۔ پھر ان امور کی روشنی میں استاد کو چاہیے کہ مواد مضمون کی تنظیم نو کرے اور اگر ضرورت محسوس ہو تو تفصیلی جانچ کے نتائج کی روشنی میں اپنے طریقہ تدریس میں بھی ضروری اصلاح کرے۔

آموزگار کے آموزشی تجربات اور اندازۂ قدر کے درمیان ایک گہرا رشتہ ہے۔ اس رشتے کو ملحوظ رکھنا چاہیے اور اندازہ قدر کے ذریعے اس رشتے کو زیادہ پائیدار بنانا چاہیے۔

'اندازۂ قدر' کا کام مسلسل ہوتے رہنا چاہیے اور ہر منزل پر اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ اندازۂ قدر کے نتائج کی روشنی میں طریقہ تدریس پر نظر ثانی ہوتی رہے۔

●●●

www.taemeernews.com

پروفیسر صادق

دلّی میں اردو تعلیم وتدریس کی صورتِ حال

دلّی میں اردو تعلیم کی صورتِ حال جیسے موضوع پر قلم اٹھاتے ہی ذہن میں دلّی کی مشہور اور ممتاز یونیورسٹیوں مثلاً دلّی یونیورسٹی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور ان کے اردو شعبوں اور اردو اساتذہ کی تصویریں ابھرتی ہیں پھر دلّی کے ان چند کالجوں کا خیال آتا ہے جہاں بی۔اے کی سطح پر ایک اختیاری مضمون اور آنرز کی حیثیت سے اردو شعروادب کی تدریس کا بھی انتظام ہے اور پھر اُن اردو اسکولوں کی طرف دھیان جاتا ہے جن کی طرف خصوصی توجہ کی ضرورت تو برسہابرس سے محسوس کی جارہی ہے لیکن عملی طور پر کچھ نہیں کیا جارہا ہے۔ جبکہ اردو تعلیم کے سلسلے میں بنیادی حیثیت کے حامل یہی اسکول ہیں لہٰذا بات کا آغاز یہیں سے کیا جانا چاہیے۔

گذشتہ دنوں دلّی سرکار کے وزیر تعلیم جناب راجکمار چوہان نے دلّی اسمبلی کے ایک ممبر کے سوال کا تحریری جواب دیتے ہوئے بتایا کہ راجدھانی کے کل 145 اسکولوں میں اردو زبان پڑھائی جاتی ہے اور ان میں سے 118 اسکولوں میں اردو زبان کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت حاصل ہے۔ وزیر موصوف نے دلّی کے اسکولوں میں اردو اساتذہ کی کمی کا اعتراف کرتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ ابھی ایسی 14 اسامیاں خالی پڑی ہیں جن پر اردو اساتذہ کے تقررات کیے جانے ہیں۔

دلّی کی موجودہ آبادی ایک کروڑ سے زیادہ ہے قومی راجدھانی خطّے میں قائم سرکاری اور غیر سرکاری اسکولوں کی تعداد کو دیکھتے ہوئے اردو اسکولوں کی تعداد افسوسناک حد تک کم ہے لیکن

www.taemeernews.com

ظاہر ہے کہ محض افسوس کرنے سے نہ تو اردو اسکولوں کی تعداد میں اضافہ ہوسکتا ہے اور نہ ہی خالی اسامیاں پُر ہوسکتی ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت دلّی میں ایک ہزار سے زیادہ اردو اسکولوں کے قیام کی ضرورت ہے کیونکہ دلّی کے ایسے کئی بڑے بڑے علاقے جہاں اہلِ اردو کی کثیر آبادی ہے مگر یہ علاقے اردو اسکولوں سے ہنوز محروم ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ مغربی دلّی کے کسی بھی علاقے میں کوئی اردو اسکول نہیں ہے جس کی وجہ سے ان علاقوں میں آباد اہلِ اردو کے تمام بچے اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کے آئینی حق سے محروم ہیں۔

اگر ہم اردو کے موجودہ اسکولوں اور ان کی کارکردگی کا ایماندارانہ جائزہ لینے کی کوشش کریں تو تہہ در تہہ بے شمار مسائل سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ گذشتہ سال میں نے اپنے ایک مضمون میں ہندوستان کے میٹروپولیٹن شہروں میں اردو تدریس کے مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے جن عمومی مسائل کا ذکر کیا تھا وہ یہ ہیں:

۱۔ اردو میڈیم اسکولوں کی افسوسناک حد تک کمی

۲۔ اردو میڈیم کے جو اسکول موجود ہیں ان میں لائق اور معقول اساتذہ کی کمی

۳۔ اردو اسکولوں میں ایسے اساتذہ کا تقرر یا تبادلہ جو اردو سے نابلد ہوتے ہیں اور اردو میڈیم کے طلبہ کو پڑھانے کی بنیادی صلاحیتوں سے محروم ہوتے ہیں۔

۴۔ نااہل اور نکمے اساتذہ کے تقررات، یہ اساتذہ ڈیوٹی پر تو حاضر ہوتے ہیں، تنخواہیں بھی پاتے ہیں لیکن اردو پڑھانے سے دلچسپی نہیں رکھتے۔

۵۔ اردو ٹیچرس کی نئی منظور شدہ پوسٹوں پر محکمہ تعلیم میں پہلے سے کام کرتے آرہے مسلم ٹیچرس کی منتقلی، خواہ وہ اردو سے واقف ہوں یا نہ ہوں اور پھر ان نئی پوسٹوں کو جنرل پوسٹوں کی حیثیت سے مشتہر کر کے ان پر غیر اردو داں امیدواروں کی تقرری۔

۶۔ اردو ٹیچرس کی پوسٹوں کو شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائبس کے زمرے میں شامل کر کے انہیں ایک طویل عرصے کے لیے منجمد کرا دینا اور اس طرح اردو تعلیم کے کاز کو بڑے اور ناقابلِ تلافی نقصانات سے دوچار کرنا۔

۷۔ اختیاری مضمون والے گروپ میں اردو کے ساتھ کہیں انگریزی، کہیں میتھس اور کہیں سائنس جیسے اہم مضمون نتھی کر دینا تاکہ اردو پڑھنے کا خواہشمند طالب علم اگر اختیاری مضمون کی حیثیت سے اردو لینا چاہے تو وہ کسی اور اہم مضمون کی تعلیم حاصل نہ کر سکے اور

www.taemeernews.com

اس طرح گویا اردو پڑھنے کی پاداش میں اپنا کیریئر تباہ کرنے پر مجبور ہو جائے۔

۸۔ پھر اردو میڈیم کی درسی کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ بھی رہ رہ کر سر اٹھاتا رہتا ہے۔ تعلیمی سال کے آغاز میں محکمہ تعلیم کی منظور شدہ درسی کتابیں بازار میں دستیاب نہیں ہوتیں، یہاں تک کہ کبھی کبھی تو پورا سال گزر جاتا ہے اور طلبہ اپنی درسی کتابوں کے دیدار کے لیے ترستے رہتے ہیں۔ اساتذہ اپنے طور پر دوسری زبانوں کی درسی کتابیں حاصل کر کے ان کے الٹے سیدھے تراجم سے کام چلانے پر مجبور نظر آتے ہیں۔

۹۔ جگہ کی قلت کو مسئلہ بنا کر دو دو تین تین مختلف درجوں کے اردو طلبہ کی کلاسیں علیحدہ علیحدہ کمروں کی بجائے ایک ہی کمرے میں لگوانا جس کی وجہ سے ناسازگار ماحول اور بدنظمی پیدا ہو جس کے نتیجے میں اردو تعلیم کا کام متاثر ہو اور اردو طلبہ کا نقصان ہو۔ ایک اور مضحکہ خیز صورتِ حال بھی کبھی کبھی کہیں کہیں دیکھنے کو ملتی ہے جس کے تصور سے بھی اذیت ہوتی ہے اور وہ یہ کہ دو دو تین تین مختلف جماعتوں کے طلبہ کو بیک وقت ایک ہی کمرے میں بٹھا کر ایک ہی استاد سے پڑھوانا۔

متذکرہ بالا اور ان سے ملتے جلتے کئی مسائل ہیں جنہیں ہم اہلِ اردو دیہاتوں، قصبوں، چھوٹے بڑے شہروں میں ہر جگہ، گذشتہ پچاس برسوں سے شکلیں بدل بدل کر اردو تعلیم کی راہوں کو دن بدن محدود اور مسدود کرتے دیکھتے، اظہارِ تاسف کرتے اور کفِ افسوس ملتے رہ جاتے ہیں۔

اس معاملے میں میٹروپولیٹن شہر خواہ دلّی ہو یا ممبئی، کولکتہ یا کوئی اور سبھی میں اردو تدریس ایسے ہی ناگفتہ بہ حالات اور مسائل سے گزر رہی ہے اور یہی وہ بنیادی مسائل ہیں جو اکیسویں صدی میں ایک زبردست چیلنج کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ غیر اردو دانوں کو اردو سکھانے کے معاملے میں دیگر میٹروپولیٹن شہروں کی بہ نسبت دلّی کے ادارے کافی فعال رہے ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور قومی کاؤنسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کل ہند پیمانے پر خط و کتاب کے ذریعہ اردو سکھانے کا کام انجام دے رہے ہیں۔ دلّی یونیورسٹی میں برسہا برس سے ایک سال کی مدت کے لیے سرٹیفکیٹ، ڈپلومہ اور ایڈوانس ڈپلومہ کورس چلائے جا رہے ہیں۔ ان میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کئی برسوں سے نہایت سنجیدگی کے ساتھ لیکن سست رفتاری سے اپنا کام سرانجام دیتا رہا ہے۔ اس طرف خصوصی توجہ مرکوز کر کے اس کی توسیع کے لیے کام کرنے کی

www.taemeernews.com

ضرورت پر کوئی دھیان نہیں دیا گیا۔ تاہم اِدھر گذشتہ چند برسوں سے حالات میں خوشگوار تبدیلی نظر آرہی ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اردو خط و کتابت کورس کے ذریعہ ملک بھر کے تقریباً ڈیڑھ ہزار طلبہ اردو سیکھتے ہیں ان میں اکثریت دلّی کے طلبہ کی ہوتی ہے۔ قومی کاؤنسل برائے فروغ اردو کے اردو ایجوکیشن سیل کی اطلاع کے مطابق ان کے خط و کتابت کورس کے ذریعہ گذشتہ دو برسوں میں ملک بھر کے تقریباً ڈھائی ہزار طلبہ نے اردو سیکھ کر سرٹیفکیٹ حاصل کیا ہیں۔ ان میں بھی اکثریت دلّی ہی کے طلبہ کی ہے۔

جواہر لال نہرو یونیورسٹی اور دلّی یونیورسٹی میں بھی اردو سرٹیفکیٹ کورس جاری ہے لیکن تجربہ یہ رہا ہے کہ ان میں داخلہ لینے والے بیشتر طلبہ وہ ہوتے ہیں جو اردو پڑھنے میں قطعی دلچسپی نہیں رکھتے ہیں ''بس پاس'' کی رعایت حاصل کرنے کی غرض سے اس کورس میں داخلہ لیتے ہیں۔ تاہم ان کے ذریعہ اردو سیکھنے والوں کی تعداد اطمینان بخش ہونے کے باوجود خاصی امید افزا ہے۔ ان طلبہ میں بیشتر اردو شعروادب میں دلچسپی رکھنے والے ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں اردو اکادمی دہلی نے بھی دلّی کے مختلف علاقوں میں غیر اردو دانوں کو اردو سکھانے کے لیے اردو سرٹیفکیٹ کورس کے مراکز قائم کر رکھیں ہیں۔ ابتدا میں ان کی تعداد صرف چار تھی جو بڑھتے بڑھتے اب گیارہ تک پہنچ گئی ہے۔ اسی طرح حال ہی میں دلّی سرکار نے اپنے غیر اردو داں ملازمین کے لیے اردو ٹیچنگ اسکیم شروع کی ہے۔ یہ چار ماہ کے اردو سرٹیفکیٹ کورس اور چھ ماہ کے ایڈوانس اردو کورس کی شکل میں چلائے جاتے ہیں جس کا فی الحال ایک ہی مرکز ہے۔

میٹروپولیٹن شہر دلّی میں غیر اردو دانوں کو اردو سکھانے والے اتنے مراکز کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ غیر اردو داں طبقوں میں اردو سیکھنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ لیکن اتنے مراکز ہونے کے باوجود اُن میں اردو تدریس کے مسائل خاصے پیچیدہ ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اردو سیکھنے کے خواہش مند یہ طلبہ مختلف ملازمتوں میں ہونے کی وجہ سے خاطر خواہ وقت نکالنے سے قاصر رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ مقامات کے فاصلے حائل ہوتے ہیں، سینٹر ایک مقام پر ہوتا ہے، طالب علم کا دفتر دوسرے مقام پر اور پھر اس کی سکونت کا مقام کہیں ہوتا ہے۔ کہیں وقت کا مسئلہ در پیش ہوتا ہے تو کہیں کنوینس کا، کہیں مرکز کے لیے جگہ حاصل کرنے کا، کہیں معقول استاد کا، مختلف ذہنی رجحانات کے حامل، مختلف پیشوں یا شعبوں سے متعلق مختلف عمروں کے افراد، مختلف ضرورتوں کے تحت اردو سیکھنے کے خواہش مند ہوتے ہیں مثلاً محکمۂ پولیس یا خفیہ پولیس کے افراد،

www.taemeernews.com

انکم ٹیکس آفیسر، بینک آفیسر، عدالتوں میں پریکٹس کرنے والے وکیل حضرات، ہندوستان کے دورِ وسطیٰ کی تاریخ یا آثارِ قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والے اسکالر، ڈراموں میں کام کرنے والے اداکار، ریڈیو ٹی.وی کے کلاکار، غزل گائیکی کے فن کار شعروادب کے شوقین وغیرہ وغیرہ۔

ان طلبہ کو ظاہر ہے کہ معمولی سوجھ بوجھ کا استاد مطمئن نہیں کرسکتا۔ جس کے نتیجہ میں طلبہ کی دلچسپی ختم یا کم ہونے لگتی ہے اور کئی لوگ تھوڑے ہی عرصے میں اردو مرکز چھوڑ جاتے ہیں اور اس طرح اردو زبان سیکھنے کی خواہش رکھنے کے باوجود اردو نہیں سیکھ پاتے۔

اردو کے کسی بھی ادارے کی طرف سے یا کسی کی طرف سے نجی طور پر میٹروپولیٹن شہروں میں اور دوسرے چھوٹے بڑے شہروں میں اردو تدریس کے گوناگوں مسائل کا صحیح جائزہ لینے کے لیے کوشش نہیں کی گئی ہے۔ ان مسائل کو سمجھ کر انہیں حل کرنے کے لیے عملی اقدام تو دور کی بات ہے۔

اکیسویں صدی کے اوائل میں اردو تدریس کو درپیش یہ وہ چند مسائل ہیں جن کی جڑیں ماضی میں بھی کافی گہری چلی گئی ہیں۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ماضی کے تجربات کو ملحوظ رکھ کر ان مسائل پر پوری سنجیدگی سے غور وخوص کر کے ان کے ممکنہ معقول حل تلاش کئے جائیں اور پھر اکیسویں صدی کے نئے چیلنجوں کو مدِ نظر رکھ کر ایک لائحہ عمل مرتب کر کے اس پر عمل درآمد کیا جائے۔

●●●

www.taemeernews.com

مزمل حسین قاسمی

تدریس بہ امداد کمپیوٹر اور اردو زبان کا فروغ

اردو زبان ہمیشہ سے ایک متحرک اور فعال زبان رہی ہے۔ زمانہ شاہد ہے کہ اس نے بدلتے حالات اور نئے تقاضوں کو اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کے لیے بڑی خوبصورتی سے اپنایا ہے۔ چاہے وہ جمالیات کا دور ہو یا دوسری جنگ عظیم کے بعد سائنس اور فنون لطیفہ کا۔ اردو زبان میں وہ وسعت ہے جو ہر طرح کے مضامین کو بحسن خوبی ادا کر سکتی ہے۔ آج کا زمانہ کمپیوٹر کا زمانہ ہے کمپیوٹر کے ذریعہ اردو کتابوں کی طباعت تو عام ہے ہی اور اب کمپیوٹر کے ذریعہ تدریس و تعلیم بھی عام ہوتی جارہی ہے۔ یہ ایک انفرادی طریقہ ہے جس میں طالب علم من چاہے علم حاصل کر سکتا ہے۔ اس میں یہ بھی آسانی ہے کہ وہ جب اور جتنا چاہے مواد لے سکتا ہے۔ ذیل کے مقالے میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کمپیوٹر کے ذریعہ کس طرح اردو کی تدریس و اشاعت کی جاسکتی ہے؟

کمپیوٹر کی مدد سے تدریس یا تعلیم اس حالت کو کہتے ہیں جب طالب علم کو کمپیوٹر کے ذریعہ ٹرمینل کے ساتھ دو طرفہ تفاعل میں مشغول ہوتا ہے۔ اس عمل میں کمپیوٹر کا استعمال کر کے نصاب کے کسی بھی حصے کو پڑھایا یا سیکھا جا سکتا ہے۔ اس طریقہ تدریس میں کمپیوٹر کا رول امدادی اشیاء کی طرح ہوتا ہے۔

www.taemeernews.com

تعلیم و تدریس میں کمپیوٹر کا استعمال:

بارکر پی (1988) نے تعلیم میں کمپیوٹر کے استعمال کو درج ذیل کاموں کے لیے بتایا ہے:

۱۔ حصول علم کے لیے بندوبست Management of Learning

۲۔ جانچ Testing

۳۔ ٹیوشن کے لیے Tutoring

۴۔ مشق کرنے کرانے کے لیے Exercising

۵۔ کالکولیٹر کی طرح کمپیوٹر کا استعمال Use of Computer as a Calculator

۶۔ لیبارٹری کی طرح کمپیوٹر کا استعمال Use of Computer as a Laboratory

۷۔ تکنیکی مواد پیدا کرنے کے لیے کمپیوٹر کا استعمال Use of Computer for Producing Technical Material

۸۔ مواد کی نشر و اشاعت Dissemination of Material

۹۔ مواد کی حفاظت Archival of Material

۱۰۔ اظہار و انشا کا ذریعہ Medeium of Expression

تدریس بہ امداد کمپیوٹر کے مختلف انداز:

Different Modes of CAI

اگرچہ تدریس بہ امداد کمپیوٹر انواع و اقسام کی کارکردگی پر مشتمل ہے لیکن تعلیمی مواد کو پیش کرنے میں زیادہ تر درج ذیل اندازوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔

۱۔ ڈرل اور مشق Drill and Practice

۲۔ ٹیوٹوریل Tutorial

۳۔ مکالمہ/گفتگو Dialogue/Conversation

۴۔ تمثیل Simulation

۵۔ بیان/پیش کش Narration/Presentation

۶۔ آنکڑوں کی ذخیرہ اندوزی Databases

۷۔ کھیل کا انداز Gaming

www.taemeernews.com

ا۔ڈرل اور پریکٹس:

تدریس بہ امداد کمپیوٹر کی سب سے آسان شکل ڈرل اور پریکٹس ہے۔جس میں کمپیوٹر کے ذریعہ مشقوں کا ایک سلسلہ طلبا کو پیش کیا جاتا ہے اور طلبا اسے کمپیوٹر پر حل کرتے ہیں۔طلبا کے جوابات بھی کمپیوٹر کے ذریعے جانچے اور پرکھے جاتے ہیں۔ پھر طلبا کے جوابات کی روشنی میں پروگرامر (استاد) نئے مشق کی کارروائی کے لیے ساخت تیار کرتا ہے۔کمپیوٹر ایک مشق کو بار بار نہیں دہراتا۔کمپیوٹر کی یادداشت میں بہت سارے مشقیہ سوالات پہلے سے بھر دیے جاتے ہیں اور کمپیوٹر فہرست سے مدوں کا انتخاب بغیر کسی ترتیب کے Randomly کرتا ہے اور انھیں اسکرین پر طلبا کے سامنے پیش کرتا رہتا ہے۔کبھی کبھی ایک ہی سلسلہ کے مشق بھی ہوتے ہیں جن میں مواد کی کڑیاں ایک دوسرے سے جڑی ہوتی ہیں۔اس طرح کمپیوٹر کے ذریعہ لامتناہی مشق پیش کیے جاسکتے ہیں۔مشقوں کی منصوبہ بندی اس طرح کی جاتی ہے کہ طلبا کا جواب صحیح ہونے پر صحیح کا نشان اسکرین پر آجاتا ہے اور اگر غلط ہے تو ''دوبارہ کوشش کیجئے'' Try Again'' کا نشان اسکرین پر آتا ہے یا صحیح جواب کی طرف علامتی اشارہ کر دیا جاتا ہے یا صحیح جواب بذات خود اسکرین پر آجاتا ہے۔اس طریق کار میں طلبا کے جوابات کا بھی تجزیہ کیا جاتا ہے تاکہ پروگرام کی کامیابی کا اندازہ لگایا جاسکے اور مزید ترمیمات کی جاسکیں۔

ڈرل اور پریکٹس میں درج ذیل اقسام کے مشق ہوتے ہیں:۔

(الف) مختصر ترین سوالات

۱۔ خالی جگہوں کو بھرو

۲۔ صحیح یا غلط پر نشان لگاؤ

۳۔ ایک لفظ یا ایک جملے میں جواب دو

۴۔ کثیر انتخابی سوالات Multiple Choice Questions

۵۔ جماعت سے کون باہر ہے؟ Odd man out

(ب) مختصر تر سوالات جن کا جواب ایک یا دو جملوں میں ممکن ہو۔عموماً لمبے سوالات کو پوچھنے سے گریز کیا جاتا ہے جن کے جوابات میں زیادہ ٹائپ کرنے کی ضرورت ہو۔

(ج) عملی کام جیسے خاکہ کشی، خطوط کشی، لائن گراف، بار گراف، ہسٹوگرام، پائی ڈائگرام، فلو ڈائگرام وغیرہ بنانا، ناپ تول کرنا اور چیزوں کو ان کی خصوصیات کے مطابق ترتیب دینا کمپیوٹر کے عملی کاموں میں ممکن ہے۔

www.taemeernews.com

۲۔ ٹیوٹوریل:

ٹیوٹوریل میں زیرِ مطالعہ مضمون کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں بانٹ دیا جاتا ہے جسے فریم کہا جاتا ہے۔ان فریموں کو کمپیوٹر کے ذریعہ سلسلہ وار پیش کیا جاتا ہے۔پہلی نظر میں ٹیوٹوریل پروگرام اس پروگرام تدریس کے مشابہ نظر آتا ہے جسے ۱۹۶۰ء کے عشرہ میں تدریسی مشین کے لیے ترویج کیا گیا تھا۔لیکن ٹیوٹوریل میں متن کی پروگرامنگ بیک وقت کئی مسائل کو پیش کرنے کے لیے کیا جا سکتا ہے۔ خاص کر اس بات کی توثیق بھی کی جاتی ہے کہ طالب علم نے موجودہ قدم پر اتنی مہارت حاصل کر لی ہے کہ وہ اب دوسرے قدم کے فروعات نکال سکتا ہے۔طلبا کی ضرورت، ان کی ترجیحات کا تعیین اور مواد سے مزید برانچ نکالنے کے لیے کمپیوٹر کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں طلبا پر بوجھ بڑھائے بغیر مواد کو مزید پیچیدہ بنایا جا سکتا ہے۔ اس طرح برانچنگ کے فیلڈ میں مزید برانچ کھولنے کے امکانات پیدا کرتا ہے۔ جو عام طور پر پرانی تدریسی مشین میں ممکن نہیں ہوتا۔متن کے کئی متبادل صفحات کو برانچ کرنے کے لیے کمپیوٹر میں پروگرام بنائے جا سکتے ہیں جس کے کئی راستے ہو سکتے ہیں۔ ٹیوٹوریل میں ہر طالب علم کی تشخیص چھوٹی سے چھوٹی سطح پر کی جا سکتی ہے۔اور اس کی ضرورتوں کے مطابق اسے نئے راستے پر گامزن کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ گفتگو / مکالمہ:

آج کل کمپیوٹر میں یہ بھی سہولت ہے کہ استاد اور طالب علم ڈائلاگ باکس کھول سکتے ہیں۔ یہ طریقۂ تعلیم سقراط کے ذریعہ استعمال کیے گئے سیکھنے سکھانے کے طریقے پر مبنی ہے۔اس میں استاد اور طالب علم دونوں ہی سیکھانے کا طریقہ شروع کر دیتے ہیں۔دونوں ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں اور جواب دیتے ہیں۔اس طرح کے مکالماتی ٹیوٹوریل تدریسی تعلیمی ماڈل کے اصولوں پر مبنی ہوتے ہیں جس میں بہت پیچیدہ اور فروعاتی پروگرامنگ ہوتی ہے اور وقت بھی زیادہ لگتا ہے۔اسی لیے اس طرح کے مکالماتی پروگراموں کا لکھنا ریسرچ لیبوریٹری کا کام ہوتا ہے اور وسیع پیمانے پر استعمال نہیں کیا جا سکتا، مثلاً ماحولیاتی پراگندگی پر یہ مکالمہ:

استاد: ماحولیاتی پراگندگی کسے کہتے ہیں؟

طالب علم : ماحول کیا ہوتا ہے؟

استاد : آپ کے گردوپیش کی چیزیں آپ کا ماحول ہے۔

www.taemeernews.com

طالب علم : کیا پراگندگی اور گندگی ایک ہی چیز ہے؟

استاد : دونوں مترادف الفاظ ہیں۔

طالب علم : گردوپیش کی گندگی کو ماحولیاتی پراگندگی کہتے ہیں۔

اس چھوٹے سے مکالمے میں ماحولیاتی پراگندگی کے کئی برانچ فریم بن سکتے ہیں۔ طالب علم ہر خط کشیدہ لفظ پر کلک کرے گا تو اسے الگ الگ فریم میں ان تصورات سے متعلق معلومات مل سکتی ہیں۔

مکالماتی ٹیوٹوریل کے دوران کمپیوٹر طالب علم کے بارے میں سیکھنے میں مشغول رہتا ہے اور اس سے حاصل شدہ آنکڑوں کا تجزیہ کر کے استاد (کمپیوٹر پروگرامر) اپنے آپ کو سدھارتے رہتے ہیں اور تدریسی حکمت عملی کو مزید انفرادیت کا جامہ پہناتے رہتے ہیں۔ سوال در سوال اور کثیر تجزیاتی تکنیک کا استعمال کر کے پیچیدہ اور فروعاتی تفاعلی مکالمات تیار کیے جا سکتے ہیں۔

اس کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ خرچ کے لحاظ سے موثر (Cost effective) نہیں ہے۔ مکالمات کو لکھنے اور اس سے متعلق چھوٹے چھوٹے مواد کو فریم کرنے میں استاد کو ریسرچ کرنا پڑتا ہے اور وقت زیادہ لگتا ہے۔

۴۔ تمثیل (Simulation)

حقیقی زندگی کے کچھ نظام اور پہلوؤں کو بلا واسطہ نہیں سیکھا جا سکتا۔ ان تجربات میں وقت زیادہ لگتا ہے۔ صرف زیادہ ہوتا ہے، مشکل ہے اور کبھی کبھی خطرناک بھی۔ ان پہلوؤں کو کمپیوٹر کے ذریعہ تمثیلی شکل میں آسانی سے پیش کیا جا سکتا ہے۔

تمثیل کے لیے وضع کردہ اصول آسان بھی ہو سکتے ہیں اور پیچیدہ بھی اور مشابہت اور قربت کی کوالٹی پر بھی کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ ایک ہی تمثیلی کورس میں مختلف سطح پر مشابہت کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ تمثیل میں صحت کا احساس پیدا کرنے کے لیے پروگرامر (استاد) تجرباتی غلطیوں کے اثرات سے فائدہ اٹھاتا ہے اور دوسری تمثیلات میں ترمیمات کر کے اسے پریکٹیکل کے زیادہ قریب کر دیتا ہے۔

کمپیوٹر کے ذریعہ تمثیل کے درج ذیل فائدے ہیں:

۱۔ مثالی حالات کا استعمال کر کے مشکلات اور پیچیدگیوں سے بچ سکتے ہیں مثلاً چیزوں کی مانگ اور سپلائی میں تبدیلی کو بازار کی معیشت پر اثر اندازی کی شکل میں ایک ساتھ دکھایا

www.taemeernews.com

جاسکتا ہے۔

۲۔ تمثیل کے ذریعہ لیبورٹری اور فیلڈ ورک کے تجربات پر آنے والے بھاری بھرکم اخراجات سے بچا جاسکتا ہے جیسے مختلف کثافت والے تیزابوں کو ایک تجربہ میں دکھایا جاسکتا ہے جو لیبورٹری میں ممکن نہیں یا ندی گھاٹی کے مختلف اسٹیج میں ہموار کاری کے عوامل کو بیک وقت دکھایا جاسکتا ہے۔

۳۔ عام طور پر تجربہ کے لیے درکار وقت کو کم کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ خطرناک تجربات کو بحفاظت پیش کیا جاسکتا ہے جیسے نیوکلیر اکسپلوزن، ماحول میں بڑھتی ہوئی آلودگی اور اس کے نتائج، پیڑ پودوں، جانوروں اور انسانوں پر پڑنے والے اثرات۔

۵۔ عام طور پر غیر عملی تجربات کو بھی کمپیوٹر پر تمثیل کے ذریعہ پیش کیا جاسکتا ہے جیسے ماقبل تاریخ سے لے کر اب تک کا تہذیبی اور ثقافتی ارتقاء۔

۶۔ کمپیوٹر کے ذریعہ تمثیل میں پیچیدگی کی سطح کو طلبہ کی صلاحیت کے مطابق رفتہ رفتہ بڑھایا یا گھٹایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ہر سطح پر عوامل (Variables) کا اضافہ یا کمی کی جاسکتی ہے۔

۵۔ بیان / پیش کش:

طلبا کو علمی مواد پیش کرنے کے لیے کمپیوٹر اسکرین کا استعمال تختۂ سیاہ کی طرح کیا جاسکتا ہے۔ ہم اسے الیکٹرونک بلیک بورڈ کا نام دے سکتے ہیں۔ جس پر بیان اور تشریح کے نکات آسانی سے پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اس پر عام تقریری اور تحریری طریقوں کے علاوہ چلتی پھرتی تصویروں، ہیولوں (Animation)، خاکوں اور متحرک الفاظ کا استعمال مختلف دلکش رنگوں اور موسیقی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ طلبا کو نئے علمی مواد سے متعارف کرانے کے لیے اساتذہ آسان پیش کش آسانی سے تیار کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اساتذہ ایم ایس۔ پاور پوائنٹ کا استعمال کر کے سلائڈ شو تیار کر سکتے ہیں۔ اسی طرح فرنٹ پیج کا استعمال کر کے ویب پیج تیار کر سکتے ہیں۔ ایم ایس ایکسل کا استعمال کر مختلف قسم کے آنکڑوں کو پیش کر سکتے ہیں۔

۶۔ آنکڑوں کی ذخیرہ اندوزی یا ڈاٹابیس (Databases)

سیکھنے کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ علمی مواد کے مختلف وسائل کی تلاش کی جائے اور لائبریری

www.taemeernews.com

کھنگال کر علم حاصل کیا جائے۔کمپیوٹر میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ مختلف قسم کے مضامین کے آنکڑوں کی ذخیرہ اندوزی کر سکے،اسے بعینہ سامنے لا سکے یا ان میں من چاہی ترکیبوں،ترمیموں کا استعمال کر کے طلبا کے سامنے پیش کر دے تا کہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق مواد کو براؤز کر سکیں اور اپنے مقصد کی حصولیابی کے لیے استعمال کر سکیں۔کمپیوٹر میں آنکڑوں کی ذخیرہ اندوزی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ طالب علم پوچھے گئے سوال کا جواب دے سکتا ہے، مواد سے متعلق مزید معلومات حاصل کر سکتا ہے اور ضروری مواد کو تلاشنے کے بعد اسے سنبھال کر رکھ سکتا ہے۔وہ عددی آنکڑوں کو اختصار سے پیش کر سکتا ہے اور اپنی دلچسپی کے مطابق مزید تفتیش کے لیے ممکنہ وقت کا تعین کر سکتا ہے۔

اسی طرح لائبریری میں مضمون کا کوڈ،مصنف کا انڈکس یا ٹائٹل انڈکس کا استعمال کر کے کسی کتاب یا مواد کے وسائل تلاش کیے جا سکتے ہیں۔استاد یا پروگرامر کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ موادی وسائل کی دستیابی کے لیے اس طرح کے کلیدی کام بھی فراہم کریں۔کمپیوٹر کے اصل فریم میں فراہم کردہ مواد بیک وقت تمام ٹرمینل پر دستیاب ہوتے ہیں جس سے ایک ہی وقت میں بہت سے طلبا انفرادی طور پر مستفید ہو سکتے ہیں۔یہ سہولت کتابوں میں نہیں ہے۔

۷۔کھیل کا انداز:

اب تک تدریس بہ امداد کمپیوٹر کے جن طریقوں کا تذکرہ ہوا ان میں معلومات مصنف کے وضع کردہ اصولوں کے تحت ساخت کی صورت (Structured way) میں دستیاب ہوتے ہیں۔کمپیوٹر پر کھیل کا انداز سیکھنے والوں کو اپنی طرف الگ طرح سے کھینچتا ہے۔اس میں سیکھنے والے کی امنگ برقرار رہتی ہے اور کھیل کھیل میں علمی تصورات کی پریکٹس کرائی جا سکتی ہے۔آج کل سائبر کیفوں میں ویڈیو گیم اور کمپیوٹر گیم کافی پاپولر ہے اور بچے انہیں کھیلنے میں کافی وقت ضائع کرتے ہیں۔اگر انہیں تعلیمی کھیل مہیا کرائے جائیں تو یقیناً انہیں نئے تصورات اور مہارتوں سے آسانی سے روشناس کرایا جا سکتا ہے۔جیسے موٹر ریس کے ساتھ ڈرائیونگ کے اصول،ٹریفک کے اصول،ان اصولوں اور قانونوں کی پابندی،پابندی نہ کرنے پر جرمانہ،کس غلطی پر کتنا جرمانہ،ریس کا اسکور،ریس کے اسکور میں جمع اور تفریق کا تصور،ریس کے اصول، ایکسیڈنٹ سے بچنے کا طریقہ،اکسیڈنٹ کی صورت میں ابتدائی طبی امداد وغیرہ کو اس کھیل کے

www.taemeernews.com

ساتھ آسانی سے پروگرام کیا جاسکتا ہے۔

تدریس بہ امداد کمپیوٹر کے فوائد:

کمپیوٹر کے ذریعہ سیکھنے سکھانے کے عمل میں کئی طرح سے تقویت رسانی کی جاسکتی ہے۔ کچھ اہم فوائد درج ذیل ہیں۔

۱۔ تدریس بہ امداد کمپیوٹر ایک انفرادی نظام تدریس ہے۔اس میں ہر طالب علم اپنے حساب سے کام کرنے میں خودمختار ہے۔دوسرے طلبا کی کارکردگی سے کوئی طالب علم متاثر نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ ایک ایسا تدریسی طریقہ ہے جو خود کی رہنمائی میں مطالعے کے اصول پر ڈیزائن کیا گیا ہے۔یہ طریقہ ہر مشکل سطح پر مقاصد کے حصول میں یا مہارتوں کو آگے بڑھانے میں معاون ہوتا ہے۔

۲۔ معلومات کو ساخت کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ان مضامین کے مطالعے میں زیادہ مفید ہے جن کے حقائق یا اصولوں میں مدارج (Hierarchy) پائے جاتے ہیں۔

۳۔ تدریس بہ امداد کمپیوٹر طلبا کو فعال اشتراک (Active Participation) کے لیے مجبور کر دیتا ہے۔اس کے بر خلاف کتاب پڑھنے یا لکچر سننے میں ان کا رول انفعالی اور جامد (Passive) ہوتا ہے۔

۴۔ طلبا کے تفاعلی اشتراک کے نتیجے میں کمپیوٹر فوری فیڈ بیک فراہم کرتا ہے۔ یہ فیڈ بیک اصلاحی قسم کا ہوسکتا ہے یا کمپیوٹر طلبا کے جوابات کے مطابق مختلف طریقوں رمختلف مواد کی طرف رہنمائی کرسکتا ہے۔

۵۔ تدریس بہ امداد کمپیوٹر رپورٹنگ سسٹم کا استعمال کرتا ہے جو طلبا کی ترقی کی واضح تصویر پیش کرتا ہے۔اس طرح طلبا ان مضامین کی پہچان کرسکتے ہیں جن میں ان کی ترقی خاطر خواہ ہے اور ان مضامین کی بھی جن میں ان کے لیے ترقی و اصلاح کی کافی گنجائش ہے۔

۶۔ تدریس بہ امداد کمپیوٹر استاد اور طلبا دونوں کو غیر ضروری محنت سے بچاتا ہے۔اساتذہ کو ایک ہی قسم کے تعلیمی تجربات کو ہر طالب علم کے لیے بار بار ترتیب دینے اور ہر اسٹیج پر ان کا اندازۂ قدر مقرر کرنے میں اپنا وقت اور محنت ضائع نہیں کرنا پڑتا۔ کیونکہ یہ سب پہلے سے کمپیوٹر پروگرام میں محفوظ ہوتے ہیں۔

www.taemeernews.com

۷۔ تدریس بہ امداد کمپیوٹر تجربات کا ایک وسیع میدان فراہم کرتا ہے جو کسی دوسرے طرح سے طلبا کو حاصل نہیں ہوتا۔ تدریس بہ امداد کمپیوٹر ملٹی میڈیا کی حیثیت سے کام کرتا ہے جس میں سمعی وبصری امداد کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملتا ہے اور طلبا کو محرک تکنیکوں جیسے چلتی پھرتی تصویروں، خاکہ کشی وغیرہ کا استعمال کر کے تصورات کو صاف صاف سمجھنے میں مدد کرتا ہے۔

۸۔ جہاں پر روایتی طرز کا عملی مظاہرہ کافی مشکل ہو، ناممکن ہو یا خطرناک ہو، جہاں آلات آسانی سے دستیاب نہ ہوں یا جب حقیقی حالت کے تجربے میں غیر ممکنہ لمبا وقت درکار ہو، ان تمام حالات میں تدریس بہ امداد کمپیوٹر کا تمثیلی طرز (Simulation Mode) کافی مفید ہوتا ہے۔

۹۔ تدریس بہ امداد کمپیوٹر کے ذریعہ سیکھنے والوں کو کثیر انتخابی سوالات سے کوئی بھی سوال چننے کے لیے دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح جوابات کا ایک سلسلہ دیا جا سکتا ہے جہاں ایک جواب دوسرے سے بہتر ہو۔ اس طرح تدریس بہ امداد کمپیوٹر میں طلبا کو ہر انتخاب پر ایک فیڈ بیک ملتا رہتا ہے۔

۱۰۔ تدریس بہ امداد کمپیوٹر بہت سارے مشق رڈرل فراہم کرتا ہے جو کم صلاحیت والے طلبا کے لیے کافی مفید ہوتا ہے جب کہ باصلاحیت طلبا اس سے گریز کر سکتے ہیں۔

۱۱۔ تدریس بہ امداد کمپیوٹر طلبا میں استدلال، معقولیت پسندی اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت کو بڑھا سکتا ہے۔

۱۲۔ جو طلبا تدریس بہ امداد کمپیوٹر کا استعمال کرتے ہیں وہ حصول علم میں خود رہنمائی کا راستہ اپناتے ہیں۔ ان میں خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے اور اساتذہ پر ان کا انحصار کم ہو جاتا ہے۔

تدریس بہ امداد کمپیوٹر کے حدود Limitations of CAI

جہاں تدریس بہ امداد کمپیوٹر کے بہت سارے فوائد ہیں وہیں اس کا عملی نفاذ کافی محدود ہے۔ اس کے مندرجہ ذیل حدود ہیں۔

۱۔ تدریس بہ امداد کمپیوٹر کو ایک نیا تعلیمی پیکیج کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ ابھی تک تعلیمی عمل کا غیر منفک حصہ نہیں بن سکا ہے نہ ہی اس کو وسیع مقبولیت ملی ہے جو اسے ملنا چاہیے۔

۲۔ اگرچہ تدریس بہ امداد کمپیوٹر میں تمثیلی طرز پر کیمیائی اور حیاتیاتی تجربات کیے جا سکتے

www.taemeernews.com

ہیں لیکن دستی مہارت نہیں پیدا کیا جا سکتا۔ تدریس بہ امداد کمپیوٹر کے پیکیج میں آلات کو ہاتھوں سے استعمال نہیں کیا جا سکتا، نہ ہی کسی مشین پر دستی کام کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ تدریس بہ امداد کمپیوٹر کے پیکیج کو بنانے میں اصلی صرفہ زیادہ لگتا ہے۔ پیکیج کو بنانے میں اسٹاف پر خرچ زیادہ لگتا ہے اور وقت بھی زیادہ صرف ہوتا ہے۔

۴۔ اکثر تدریس بہ امداد کمپیوٹر میں مضمون کا مواد پرانا ہو جاتا ہے۔ اگر کورس پرانا ہو گیا تو اس پر صرف کی گئی رقم بیکار ہو جاتی ہے۔

تدریس بہ امداد کمپیوٹر کے استعمال سے متعلق مسائل:

:Problems related to the use of CAI approach

۱۔ کمپیوٹر کو تعلیم میں استعمال کرنے کے لیے اساتذہ کو محرک کرنا اور ٹریننگ دینا مشکل کام ہے۔ اس نئی مشین سے ان میں ڈر بھی پیدا ہو سکتا ہے اور وہ تدریس بہ امداد کمپیوٹر کی تیاری مواد کے انتخاب اور استعمال میں زیادہ وقت دینے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ علاوہ ازیں وہ اسے اپنی ملازمت کے لیے خطرہ محسوس کر سکتے ہیں۔

۲۔ ہو سکتا ہے کہ تدریس بہ امداد کمپیوٹر پیکیج اساتذہ کے امیدوں پر پورا نہ اتر سکے۔ پیکیج پروگرامر اور اساتذہ کے مقاصد اور طریق تدریس مختلف ہو سکتے ہیں۔

۳۔ کمپیوٹر کو لگانے میں انتظامی مسائل سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ خاص کر کمپیوٹر کے محل وقوع، اس کی مرمت، ہارڈ ویر اور سوفٹ ویر کی فراہمی وغیرہ میں طلبا اور اساتذہ کی ضرورتوں کے بالمقابل انتظامی امور سے متعلقہ مسائل پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔

۴۔ تدریس بہ امداد کمپیوٹر کی کوالٹی کو برقرار رکھنے کے لیے ٹیم ورک کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک پیکیج کو بنانے میں مختلف مضامین کے ماہرین جیسے تعلیم و تدریس، پروگرامنگ، ہارڈ ویر انجینئر اور مضمون کے ماہرین کی ضرورت پڑتی ہے۔ انھیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنے میں لمبا عرصہ لگ سکتا ہے۔

۵۔ ہارڈ ویر میں تیزی سے واقع تبدیلی سے یہ خدشہ بنا رہتا ہے کہ کہیں یہ ہارڈ ویر متروک الاستعمال نہ ہو جائے۔ اگر زیادہ تر اداروں میں نیا سافٹ ویر آ جاتا ہے تو اب تک بنائے گئے پیکیج بیکار ہو جائیں گے۔

www.taemeernews.com

تدریس بہ امداد کمپیوٹر سے متعلقہ مذکورہ بالا مسائل پر قابو پانے کے لیے متعدد تعلیمی سوفٹ ویرز کو ترویج دینے کی ضرورت ہے۔ گو کہ ایسے کئی سوفٹ ویرز مختلف مضامین میں فروغ پا چکے ہیں پھر بھی تعلیمی میدان میں ان کو وسیع پیمانے پر استعمال کرنے کے لیے ان کی توثیق ضروری ہے۔

تدریس بہ امداد کمپیوٹر کی تیاری کے اقدامات:

تدریس بہ امداد کمپیوٹر کی تیاری کے مختلف مدارج اور ان میں اٹھائے گئے اقدامات تدریسی مواد اور مسئلے کی فطرت کے مطابق الگ الگ ہو سکتے ہیں پھر بھی مجموعی طور پر پیکیج کی تیاری میں درج ذیل پہلوؤں کا لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

۱۔ تجزیاتی مرحلہ Analysis Phase
۲۔ ڈیزائن مرحلہ Design Phase
۳۔ پروگرامنگ مرحلہ Programming Phase
۴۔ توثیقی مرحلہ Validation Phase

۱۔ تجزیاتی مرحلہ Analysis Phase:

۱۔ تدریسی اکائی کا انتخاب Selection of Teaching Unit

کمپیوٹر سب سے زیادہ موثر میڈیا ہے اور اس میں دوسرے ذرائع ابلاغ کے بالمقابل زیادہ پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے اس کا استعمال تخلیقی اور مشکل کاموں کے لیے منصفانہ طور پر کرنا چاہیئے۔ کسی تدریسی اکائی کے انتخاب کے بعد جب استاد تدریس بہ امداد کمپیوٹر کے لیے پروگرام تیار کرنے کا فیصلہ کر لے تو سب سے پہلے غور کرنا چاہیے کہ کمپیوٹر کا طریقہ ہی کیوں؟ اسے تدریس بہ امداد کمپیوٹر کا پیکیج تیار کرنے سے پہلے درج ذیل سوالات پر غور کرنا چاہیے۔

☆ کیا میرے طلبا دوسرے ذرائع ابلاغ یا دیگر تخلیقی طریقوں کا استعمال کر کے اس سے زیادہ سیکھ سکتے ہیں؟

☆ کیا میرے موضوع کا مقصد ایسا ہے جو صرف تدریس بہ امداد کمپیوٹر سے ہی پورا کیا جا سکتا ہے؟

www.taemeernews.com

☆ کیا میرا پیکیج طلبا کو انفرادی تعلیمی تجربات سے روشناس کرا سکتا ہے؟
☆ کیا یہ پیکیج طلبا کے ساتھ تفاعلی کردار ادا کر سکتا ہے؟
☆ کیا اس میں استعمال کنندہ کا کنٹرول (Users Control) ہے یا خود کو جانچنے کا طریقہ (Self-Evaluation Method) ہے؟

اگر استاد کے پاس ان سوالوں کا جواب تشفی بخش ہے تو تدریسی اکائی کا انتخاب کرے اور اگلے قدم پر منتخبہ اکائی کے مواد کا تجزیہ کرے۔

۲۔ مواد کا تجزیہ Content Analysis:

تدریسی پیکیج کو خود آموزش پروگرام بنانے کے لیے مواد کا مناسب تجزیہ کرنا پڑتا ہے۔ استاد کو موضوع کے ہر نکتے کی پہچان کرنی پڑتی ہے۔ موضوع کو ذیلی عنوانات یا ذیلی نکات میں تقسیم کرنے کے طریقے کو مواد کا تجزیہ کہا جاتا ہے۔ مواد کا تجزیہ استاد کو سبق سے متعلق تمام تصورات، تعریفات، معلوماتی نکات، اصول، فارمولے، مثال، خاکے، گراف وغیرہ کی پہچان کرنے میں مدد کرتا ہے۔ اس تجزیہ کے ساتھ اسے یہ بھی فیصلہ کرنا ہوگا کہ کس مواد کو مستقیم پروگرام میں رکھنا ہے اور کتنے مواد کو برانچ پروگرامنگ میں ڈالنا ہے تا کہ طلبا بوقت ضرورت برانچ کو براؤز کر کے حوالہ جاتی مواد کا بھی مطالعہ کر سکیں۔

۳۔ اندراجی کردار کی وضاحت : Analysis of Entry Behaviour

پروگرامر یا استاد کے لیے ٹارگیٹ گروپ کا تجزیہ بہت ضروری ہے۔ کسی بھی تعلیمی سوفٹ ویر کو تیار کرنے سے پہلے استاد کو طلبا کے ماقبل علم کا تجزیہ کر لینا چاہیے۔ اس سلسلے میں طلبا کا فرہنگ یا ان کے پاس موجود الفاظ کا خزانہ، ان کی تعلیمی اور تفہیمی سطح، ان کے سیکھنے کا انداز اور ان کی ضرورت کا تجزیہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ مواد اور ٹارگیٹ گروپ کا تجزیہ کر لینے کے بعد استاد تصورات کے سلسلے کو منطقی طور پر ترتیب دے سکتا ہے۔ یہاں موضوع کو سیکھنے کے لیے ماقبل ضروریات کی پہچان کرنا استاد کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اگر طلبا بنیادی تصورات سے واقف نہیں ہیں تو آپ کے موضوع کے مواد کو نہیں سیکھ پائیں گے۔ اس لیے طلبا کے اندراجی کردار کی وضاحت پوری طرح سے ہونی چاہیے۔

۴۔ مقصد کی وضاحت : Specification of Objectives

کسی بھی پروگرام کے تدریسی مقصد کا بیان بالکل ایسے ہی ہے جیسے پوری تدریسی کارروائی

www.taemeernews.com

کو مختصر طور پر پیش کر دینا۔ مقصد کی وضاحت میں درجہ ذیل سوالات پوچھے جائیں۔

۱۔ اس پروگرامنگ تدریس سے میرے طلبا میں کون سی تبدیلیاں ہوں گی؟
۲۔ مضامین سے متعلق طلبا کن کن باتوں کو سیکھ پائیں گے؟
۳۔ کمپیوٹر سے متعلق کن باتوں کو سیکھ پائیں گے؟
۴۔ تدریس و تعلیم کے کن طریقوں کو سیکھ پائیں گے؟

۵۔ اندازہ قدر کی تعین : Development of Evaluation Measures

مقصد کی وضاحت درحقیقت بتدریج فروغ دی جانے والی اس صلاحیت کا بیان ہے جو ہم طلبا میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ وضاحت اندازہ ءقدر کا تعین اور اس جانچ کو بنانے میں معاون ثابت ہوتی ہے جس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ طالب علم میں مطلوبہ صلاحیت کتنی پیدا ہوئی؟ ایک واضح مقصد کو تحریر میں لانے کے بعد جانچ کی فوری ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ خود آموزشی مواد کا ایک تقاضہ یہ بھی ہوتا ہے کہ طلبا کا ایک ماقبل جانچ (Pre-test) کر لیا جائے تا کہ استاد فیصلہ کر سکیں کہ آیا طالب علم اس مواد کو اخذ کرنے کے لائق ہیں، طلبا کو اس مواد کی یا پیش کردہ کسی ذیلی اکائی کی ضرورت ہے یا وہ اسے چھوڑ سکتے ہیں۔ ابھی تک کا تجربہ یہ ہے کہ اساتذہ خود فیصلہ کرتے ہیں کہ ان کے طلبا کو کیا سیکھنا ہے اس بات سے قطع نظر کہ طالب علم خود کیا سیکھنا چاہتا ہے یا کیا سیکھ چکا ہے۔ خود آموزشی مواد میں یہ سہولت ہوتی ہے کہ ہر طالب علم انفرادی طور پر دیکھے کہ وہ کیا جان چکا ہے یا اسے کیا جاننا چاہیے۔ اسی کے بنیاد پر جانچ یا اندازہ ءقدر کو فروغ دینا چاہیے۔

۲۔ ڈیزائن کا مرحلہ: Design Phase

تدریس بہ امداد کمپیوٹر میں تجزیاتی مرحلے کے بعد تخلیقی مرحلہ شروع ہوتا ہے جس میں سب سے پہلے ڈیزائن کا مرحلہ آتا ہے۔ اس کے درج ذیل اقدام ہیں۔

۱۔ معیاری ساخت کی تشکیل : Development of Modular Structure

چونکہ تدریس بہ امداد کمپیوٹر خود آموزش کا راستہ ہے اس لیے اس میں انفرادی تفریق کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ بڑے پیمانے کے تعلیمی عمل کو چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ کر ایک معیاری ساخت (Modular Format) کی تشکیل کی جا سکتی ہے۔ اس طریقے میں صاف طور پر الگ

www.taemeernews.com

الگ بتائے گئے علاقۂ علم وعمل کو طلبا اپنی ضرورت کے مطابق سیکھ سکتے ہیں۔اس طرح ایک طالب علم اسی خاص ذیلی عنوان یا مضمون پر اپنی توجہ مرکوز کرے گا جس میں وہ مہارت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے معیاری ساخت کی تشکیل میں کورس ڈیزائن کرنے والے کو ہر ساخت (Modular Format) کا ایک الگ عنوان دینا چاہیے۔اس کے ساتھ مقاصد اور پیش کش کے طریقوں کو بھی بتا دیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔اس طرح تدریس بہ امداد کمپیوٹر کا پورا پیکیج مختلف قسم کے آپسی تعلق والے معیاری ساختوں کا مجموعہ بن جاتا ہے۔گرچہ یہ ماڈیول آپس میں متصل ہوتے ہیں لیکن ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر کے سیکھا جا سکتا ہے۔طلبا کو مناسب ماڈیول کے انتخاب میں ماقبل جانچ معاون ہوسکتا ہے۔

۲. فلو چارٹ کی تشکیل : Development of Flowchart

فلو چارٹ یا رواں جدول واقعات، اعمال اور تصورات کے درمیان تعلقات کی روانی کو دکھاتا ہے۔ یہ ایک طرح سے سبھی کاموں کے بیچ تعلقات کی روانی کا خاکائی پیش کش ہوتا ہے۔ یہ تعلقات زمانی (Temporal) یا مکانی (Spatial) یا دونوں ہو سکتے ہیں لیکن ان میں ہمیشہ ایک خاص ترتیب ہوگی۔ جب استاد ایک کورس دیر میں استعمال ہونے والے تمام علمی مواد کو اکٹھا کر لے اور انھیں پیش کرنے کے اصول وضوابط کو وضع کر لے تو اب اسے اسکرین پر پیش کرنے کے لیے فلو چارٹ کی ضرورت ہوگی ۔ یہ رواں جدول استاد کے ذریعہ تیار کردہ فریموں کے درمیان ترتیب اور تسلسل قائم رکھتا ہے۔فلو چارٹ میں سبھی فریموں کے نمبر پڑے ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہائپرلنک سے جڑے لوپ فریموں کے نمبر بھی ہوتے ہیں۔اس طرح فلو چارٹ کے ذریعہ فروعی پروگراموں (Branched Programming) سے بچا جا سکتا ہے۔

۳. فریم ڈیزائن : Designing Frame

تدریس بہ امداد کمپیوٹر کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ایک ہی عنوان کو کئی چھوٹے پیکیج میں تیار کر کے پیش کیا جا سکتا ہے۔ایک ماڈیول فریموں کے کئی سلسلوں پر مشتمل ہوتا ہے جیسے معیاری فریم، تدریسی فریم، جانچ فریم وغیرہ۔

(الف) معیاری فریم : Criterion Frame

معیاری فریم کو تدریسی فریم سے پہلے تیار کیا جاتا ہے جس میں تدریسی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے تدریسی فریموں کا معیار مقرر کیا جاتا ہے۔اس میں طلبا کی رہنمائی کی جاتی ہے

www.taemeernews.com

کہ وہ تدریس بہ امداد کمپیوٹر سے کس طرح اپنے مطلوبہ منزل تک پہونچیں گے۔ اس فریم میں تدریسی نکات یا حوالے وغیرہ نہیں دیے جاتے۔

(ب) تدریسی فریم:Teaching Frame

تدریسی فریم میں وہ تمام معلومات مہیا کرائے جاتے ہیں جو کورس کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہیں۔

(ج) جانچ فریم:Testing Frame

جانچ فریم میں تدریسی نکات والے ہر فریم سے سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ اسی فریم کے ساتھ تحریص یا اشاریہ کے ہائپر لنک بھی ہوتے ہیں جو غلط جواب کو درست کرنے کے لیے صحیح علمی مواد کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۴۔اصل پروگرام سے متعلق اسکرین کی تیاری :

Preparing Screens with reference to Actual Programmming

اسکرین کی تیاری میں درج ذیل باتوں کا دھیان رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

۱۔ اسکرین خاکہ:Screen Layouts

ٹرمینل اسکرین پر کیا دکھانا ہے؟ اس سے متعلق کچھ اصول درج ذیل ہیں:

۱۔ ایک اسکرین سے دوسرے اسکرین تک فریم ترتیب وار ہوں۔

۲۔ بیان کی ترتیب ایسی ہو جیسے عمل کر کے دکھایا جا رہا ہو۔

۳۔ بہت زیادہ مخفف الفاظ کا استعمال نہ کیا جائے۔

۴۔ اسکرین کو بہت زیادہ معلومات سے پر نہ کیا جائے۔

۵۔ توجہ مرکوز کرنے کے لیے ٹمٹماتی روشنی (Blinking) کا استعمال ہو لیکن زیادہ نہیں

۶۔ مین مینو(Main Menu)، جانچ، Help, Quit, Hyperlink وغیرہ کے لیے علامات ہر اسکرین پر یکساں ہوں۔

۲. متن Text

متن کا مواد بہت زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ ایک پیراگراف دو یا تین لائنوں سے زیادہ نہ ہو۔

۳۔خاکے Graphics

خاکوں اور رنگوں کا استعمال سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔ بہت زیادہ ٹھوس خاکوں کا استعمال یا

www.taemeernews.com

غیر ضروری رنگوں کا استعمال سبق کو غیر دلچسپ بنا دیتا ہے۔پس منظر میں ایک رنگ کا استعمال زیادہ بہتر ہے۔لال اور نیلا یا سفید اور پیلا رنگ کی ملاوٹ سے گریز کرنا چاہیے۔

۴.متحرک ہیولے Animation

متحرک ہیولے اور تصویریں توجہ کھینچتی ہیں لیکن ان کا غیر ضروری استعمال بھی سبق میں عدم دلچسپی کا باعث بن جاتا ہے۔ پروگرام میں خاص خیال رہے کہ یہ ہیولے استعمال کنندہ کے کنٹرول میں رہے کہ جب وہ چاہے بند کر دے۔

۵. آواز Sound

آواز کا استعمال الفاظ کے مخارج اور سننے کی مہارت پیدا کرتا ہے۔غلط جواب کے لیے بزر کا استعمال مفید ہے۔لیکن تحریری متن کو آواز میں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔آواز کا زیادہ استعمال طالب علم کو اصل مقصد سے دور بھی کر سکتا ہے۔

۶. وقت Timing

تدریس بہ امداد کمپیوٹر میں وقت کی موافقت پر خاص زور دیا جاتا ہے تا کہ طالب علم ایک خاص وقفے میں ایک خاص رفتار سے سیکھنے کا کام پورا کر سکیں۔ پروگرام کی تیز رفتاری یا اسکرین کے جلدی جلدی بدلنے سے طلبا مواد اخذ نہیں کر پاتے ہیں۔اسی طرح سست رفتاری یا اسکرین پر ایک ہی مواد کو زیادہ دیر رہنے سے طلبا دلچسپی کھو بیٹھتے ہیں اور بور ہونے لگتے ہیں۔

۷. استعمال کنندہ کنٹرول User Control

طلبا پر مرکوز طریقہء تعلیم میں تفاعل (Interactivity) کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر فریم اور ہر مرحلے پر طلبا کی تقویت رسانی ضروری ہے۔اس لے ہر اسکرین پر استعمال کنندہ کا کنٹرول ہونا چاہیے۔ یہ سہولت تدریس بہ امداد کمپیوٹر میں بدرجہء اتم موجود ہے۔ پروگرامر یا استاد کو یہ سہولت ہر فریم، ہر تدریسی نکتے، سوالات، جوابات، حوالہ جات وغیرہ پر دینا چاہیے تا کہ طلبا کو ہر قدم پر فیڈ بیک مل سکے۔

۳۔ پروگرامنگ مرحلہ Programming Phase

پروگرامنگ مرحلے میں درج ذیل عناصر کی پروگرامنگ کرنی پڑتی ہے۔ استاد کو کسی ماہر پروگرامر سے مشورہ بھی کر لینا چاہیے۔

www.taemeernews.com

۱۔ متن اور سوالات کا اسکرین پر پیش کش

Presentating text and questions on a screen

۲۔ کی بورڈ کے استعمال سے جوابات کی قبولیت

Accepting responses entered using a keyboard

۳۔ جوابات کا تجزیہ Analysing responses

۴۔ ایک فائل میں جوابات اور ان کے نمبرات کی ذخیرہ اندوزی Storing details of

Responses and Values of Counters on a file

۵۔ تعلیمی پروگرام کے دیگر فردعاتی حصے بنانا

Branching of other parts of learning programmes

۶۔ فیڈ بیک مہیا کرنا Providing feedback

۷۔ کمپیوٹر پروگرام کی زبان سے ہم آہنگی

Interface with computer programming language

۴۔ توثیقی مرحلہ :Validation Phase

توثیقی مرحلے پر متن، متن اور پروگرام کی صحت، پیش کش، آنکڑوں وغیرہ کی توثیق ماہرین کے ذریعہ ہونی چاہیے۔ اس کے لیے درج ذیل اقدام ہیں۔

۱۔ ماہرین کے ذریعہ جانچ Evaluation by Experts

۲۔ ماقبل جانچ اور مابعد جانچ Pre-Test and Post-Test

۳۔ پائلٹ مطالعہ Pilot Study

۴۔ میدانی کوششیں Field Try-out

اردو زبان کی ترویج اور فروغ کے لیے کمپیوٹر کے ذریعہ تعلیم و تدریس نئی جہات اور امکانات کا ایک ایسا وسیع میدان پیش کرتا ہے جس میں اردو کی رسائی ہر گھر میں ہر فرد تک ہو سکتی ہے۔ اسکول، کالج، مدارس اور جامعات میں اردو کی انفرادی تعلیم عام ہو سکتی ہے اور سرکاری اور غیر سرکاری تنظیموں کے دفاتر میں اردو کا استعمال بڑھ سکتا ہے۔ اس سلسلے میں دلی سرکار کا محکمہ السنہ اردو سیل کی کوششیں قابل ستائش ہیں جس نے اردو زبان کا فروغ: جہات اور امکانات کے

www.taemeernews.com

عنوان سے دو روزہ قومی سیمینار منعقد کیا۔لیکن ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو سیل ہر مضمون سے کمپیوٹر کے منصوبہ بند اسباق تیار کرائے اور اپنے خصوصی اردو ویب سائٹ پر پیش کرے۔

●●●

www.taemeernews.com

سیّد شریف الحسن نقوی

سرکاری سرپرستی میں اُردو کا فروغ: وسائل اور امکانات

آزادی کا سورج طلوع ہونے سے بہت قبل انڈین نیشنل کانگریس نے مارچ ۱۹۳۱ء میں اپنے کراچی کے اجلاس میں اور فوراً بعد اکتوبر ۱۹۳۱ء میں مہاتما گاندھی نے ہندوستانی گول میز کانفرنس کی اقلیتی کمیٹی میں ملک کے لسانی مسئلہ کا حل تلاش کرنے کی جو مثبت کوششیں کی تھیں وہ یقیناً امید افزا تھیں اور دونوں کوششوں کو سامنے رکھ کر دستور ساز اسمبلی کی اقلیتی سب کمیٹی نے اپریل ۱۹۴۷ء کی اپنی عبوری رپورٹ میں اقلیتوں کے ثقافتی اور تعلیمی حقوق کے ضمن میں جو متعدد تجاویز پیش کی تھیں وہ بہت واضح اور مکمل تھیں۔ ان چھ تجاویز میں سے تجویز نمبر ۱ اور ۲ بنیاد بنیں دستور کی ان دفعات کی جن کے تحت اقلیتوں کو ثقافتی اور لسانی حقوق دیے گئے۔

تجویز نمبر ۱:

> "تمام شہریوں کو حق ہوگا کہ وہ اپنی مادری زبان اور اس کے رسم الخط کو اختیار کریں اور حسبِ ضرورت کسی دوسری زبان کا مطالعہ اور استعمال اپنی پسند کے مطابق کریں۔"

تجویز نمبر ۲:

> "ہر یونٹ (ریاست) میں اقلیتوں کے لسانی اور ثقافتی حقوق کی

www.taemeernews.com

حفاظت کی جائے گی اور کوئی حکومت کوئی ایسا قانون یا ضابطہ نہیں بنائے گی جس سے ان حقوق کی پامالی یا خلاف ورزی ہو۔"

ڈرافٹ کمیٹی میں سب کمیٹی کی ان دونوں اور دیگر تجاویز پر گرما گرم بحث ہوئی تجاویز کے حق اور مخالفت میں ممبران نے اپنے خیالات کا مدلل اظہار کیا۔ زیڈ.ایچ.سوری، بیگم اعزاز رسول، مولانا حسرت موہانی اور ان کے ہم نوا ممبران نے ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دینے کی پرزور وکالت کی۔ مہر لال چٹو پادھیائے بھی اس موقف کے حق میں تھے اور ان کا خیال تھا کہ اقلیتوں کا خطرہ جائز ہے اس لیے دستور میں واضح ہدایات ہونی چاہیے۔ تجویز کی مخالفت میں متعدد ممبران نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس وقت کے یوپی کے وزیر اعلیٰ پنڈت گووند بلبھ پنت نے تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے کہا:

"یونین آف انڈیا میں رہنے والے ہر شہری کا حق ہے کہ ہم حکومت کے ذریعہ اس کے جائز حقوق کی حفاظت کریں۔ ہمیں موجودہ اور آئندہ وسائل کو اس طرح استعمال کرنا ہوگا کہ اس سے ہر ایک کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے۔

مسٹر سوری کو ہم سے یہ امید نہیں رکھنی چاہیے کہ ہم ٹیکس دہندگان کی رقوم کو کسی کو خوش کرنے کے لیے اس پر زیادہ صرف کریں... اگر اس تجویز پر عمل کیا گیا تو ہر اسکول میں اُردو اور ہندی کے الگ الگ استاد رکھنے ہوں گے... اگر ایسا ہوتا ہے تو ہم قیامت تک تمام طالب علموں کو تعلیمی دائرے میں نہیں لاسکیں گے..."

بہر حال انتہائی بحث و مباحثہ کے بعد زبان کے مسئلہ پر دستور ساز اسمبلی نے ستمبر ۱۹۴۹ء میں مندرجہ ذیل دفعات پاس کیں:

۲۹_۲۹(۱) ۳۰_۳۰(۱)۳۰ (۲)_۱۲۰ _۱۲۰(۱)_۲۱_۲۱(۱) ۳۴۳_۳۴۳(۱)

۳۴۴_۳۴۵_۳۴۶_۳۴۷_۳۵۰_۳۵۰(۱)_۳۵۰(ب)اور ۳۵۱

جب ۲۶ رجنوری ۱۹۵۰ء میں دستور کا نفاذ ہوا تو ان سب دفعات کی قانونی حیثیت ہوگئی۔

مندرجہ بالا تمام دفعات میں دفعہ ۲۹(۱)(۲)_۳۰(۱)۳۰(۲)_۳۴۷، ۳۵۰اور ۳۵۰(الف) ہمارے لیے بہت اہم ہیں۔ اس لیے اُردو سے متعلق کوئی بات کرتے وقت ہمیں

www.taemeernews.com

ان دفعات کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔ مناسب ہوگا کہ ہم ان دفعات کو یہاں پیش کر دیں۔

دفعہ ۲۹ (۱) :

'' بھارت کے علاقے میں یا اس کے کسی حصے میں رہنے والے شہریوں کے کسی طبقہ کو جس کی الگ اپنی جداگانہ زبان ، رسم الخط یا ثقافت ہو، اس کو محفوظ رکھنے کا حق ہوگا''۔

دفعہ ۲۹ (۲)

'' کسی شہری کو ایسے تعلیمی ادارے میں جس کو مملکت چلاتی ہو یا جس کو مملکتی فنڈ سے امداد ملتی ہو، داخلہ دینے سے مذہب ، نسل، ذات، زبان یا ان میں سے کسی کی بنا پر انکار نہیں کیا جائے گا''۔

دفعہ ۳۰ (۱)

'' تمام اقلیتوں کو خواہ وہ مذہب کی بنا پر ہوں یا زبان کی، اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کا انتظام کرنے کا حق ہوگا''۔

دفعہ ۳۰ (۲)

'' مملکت تعلیمی اداروں کو امداد عطا کرنے میں کسی تعلیمی ادارے کے خلاف اس بنا پر امتیاز نہ برتے گی کہ وہ کسی اقلیت کے زیر انتظام ہے خواہ وہ اقلیت مذہب کی بنا پر ہو یا زبان کی''۔

دفعہ ۳۴۷

'' اس بارے میں مطالبہ کیے جانے پر صدر، اگر وہ مطمئن ہو کہ کسی ریاست کی آبادی سے قابل لحاظ تناسب کی خواہش ہے کہ وہ ریاست کی کسی زبان کے استعمال کو جس کو وہ بولتے ہیں، تسلیم کرے، تو ہدایت کر سکے گا کہ ایسی زبان بھی اس ریاست بھر میں یا اس کے کسی حصے میں اُس غرض کے لیے، جس کی وہ صراحت کرے، سرکاری طور پر تسلیم کر لی جائے''۔

دفعہ ۳۵۰

'' ہر شخص کو کسی شکایت کے ازالہ کے لیے یونین یا کسی ریاست

www.taemeernews.com

کے کسی عہدہ دار یا حاکم کو ان زبانوں میں سے کسی زبان میں جو یونین یا
اس ریاست میں، جیسی کہ صورت ہو، استعمال ہوں۔ عرض داشت پیش
کرنے کا حق ہوگا''۔

دفعہ ۳۵۰ (ا)

''ہر ریاست اور اس ریاست کے اندر ہر مقامی حاکم کی کوشش
ہوگی کہ لسانی اقلیتی زمروں سے تعلق رکھنے والے بچوں کو تعلیم کے ابتدائی
درجے میں مادری زبان میں تعلیم دینے کی کافی سہولتیں مہیا کرے اور
صدر کسی ریاست کو ایسی ہدایتیں اجرا کر سکے گا جو ایسی سہولیتیں مہیا
کرنے کے لیے وہ ضروری یا مناسب سمجھے''۔

میمورنڈم اور مطالبات:

مختلف حکومتوں نے مرکز اور ریاستوں میں جو قوانین اور ضابطے اُردو سے متعلق پاس کیے ہیں یا حکومت کو مشورہ دینے کے لیے جو کمیٹیاں تشکیل دی گئی ہیں وہ سب ان دستوری ہدایات کی روشنی میں ہی معرض وجود میں آئی ہیں۔ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اب تک جو کچھ کیا گیا ہے وہ اس قدر نا کافی ہے کہ صاف نمایاں ہے کہ دستور کی ہدایات کا حق ادا نہیں ہوا ہے۔ اسی لیے مختلف انجمنوں نے جن میں انجمن ترقی اُردو (ہند) سر فہرست ہے صدرِ مملکت، وزیراعظم، ریاستوں کے وزیراعلیٰ اور مرکزی اور ریاستی وزرائے تعلیم سے بار بار ان ہدایات کے مطابق فوری کارروائی کرنے، قوانین اور ضابطے بنانے اور ہدایات جاری کرنے کی درخواست کی ہے۔ پارلیمنٹ اور اسمبلی کے ممبران بار بار پُر زور تقاضے کرتے رہے ہیں مگر ان کی یہ گزارشات عموماً صدا بہ صحرا ہی ثابت ہوئی ہیں۔ خود انجمن ترقی اُردو (ہند) نے صدرِ مملکت کی خدمت میں اُردو کو اس کا جائز حق دلوانے کے لیے اب تک پانچ میمورنڈم پیش کیے ہیں۔ ان میں سب سے اہم قابلِ توجہ میمورنڈم ۲ر جنوری ۱۹۵۴ء کو انجمن کے اس وقت کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین نے اترپردیش کے بائیس لاکھ سے زیادہ اُردو بولنے والوں کے دستخط سے اس وقت کے صدر مملکت ڈاکٹر راجیندر پرشاد کی خدمت میں پیش کیا جس میں دیگر مطالبات کے ساتھ ساتھ ابتدائی تعلیم اُردو کے ذریعہ دینے کا مطالبہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اسی طرح کے میمورنڈم پنڈت نہرو اور لال بہادر شاستری کو چھوڑ کر دیگر تمام وزرائے اعظم کو پیش کیے گئے۔ ان تمام گزارشات کا حاصل

www.taemeernews.com

لسانی اعلانیہ اور متعدد کمیٹیوں کی شکل میں ہمارے سامنے آیا۔

لسانی کمیٹیاں:

جب کبھی اُردو والوں کے مطالبات نے زیادہ شدت اختیار کی تو حکومت نے کوئی نہ کوئی کمیٹی تشکیل دے کر ان مطالبات کو سرد خانے میں ڈال دیا۔ ان کمیٹیوں میں سرِ فہرست گجرال کمیٹی ہے جو ۵ رمئی ۱۹۷۲ء کو ''کمیٹی برائے فروغ اُردو'' کے نام سے تشکیل دی گئی۔ چونکہ اس کے سربراہ اس زمانے کے مرکزی کابینہ کے وزیر اندر کمار گجرال تھے۔ اس لیے اس کمیٹی نے انھیں کے نام سے شہرت پائی۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کمیٹی نے ملک کے گوشے گوشے سے اطلاعات جمع کیں۔ اُردو والوں سے گفتگو کی۔ انجمنوں کے میمورنڈم اور مطالبات پر غور کیا اور ایک نہایت جامع رپورٹ پیش کی۔ اس سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ اس کی کچھ سفارشات پر احکامات بھی جاری ہوئے مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بیشتر سفارشات نے کبھی حکومت کی توجہ اپنی طرف مبذول نہ کرا سکیں اور تو اور جب خود گجرال صاحب وزیر اعظم ہوئے تو ۲۱ رنومبر ۱۹۹۷ء کو اُردو والوں کا ایک وفد اس مطالبے کے ساتھ ان سے ملا کہ کم از کم وہ خود فوری قابل عمل اپنی کمیٹی کی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کا حکم جاری کریں چند دن بعد ہی ان کی وزارت نے استعفیٰ دے دیا اور یہ توقع بھی رائگاں ثابت ہوئی۔

گجرال کمیٹی کی سفارشات پر کیا عمل ہوا، اس کا جائزہ لینے کے لیے سردار جعفری کمیٹی وجود میں آئی۔ کچھ عرصہ کے بعد ''گروپ آف مائنارٹیز'' کے نام سے سید حامد صاحب کی صدارت میں ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی۔ کچھ عرصہ بعد اقلیتوں کے اقتصادی اور لسانی مسائل پر غور کرنے کے لیے مدھیہ پردیش کے سابق وزیر، عزیز قریشی کی صدارت میں ٹاسک فورس کمیٹی بنی اور تجاویز کے علاوہ اس کمیٹی نے اُردو یونیورسٹی کے قیام کی تجویز بھی پیش کی۔ کمیٹی کی یہ تجویز منظور ہوئی اور نتیجہ میں مولانا ابوالکلام آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی وجود میں آئی۔ جو اس وقت سرگرمِ عمل ہے اور جس سے اُردو والوں کی توقعات وابستہ ہیں۔

اُردو دوسری سرکاری زبان:

اُردو والوں کی جدوجہد کی سب سے بڑی حصولیابی ہے بہار، یوپی اور دہلی میں اُردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دینا۔ اس سلسلے میں بنیادی کام حکومت اندھرا پردیش کا ہے۔ عرصہ

www.taemeernews.com

سے ریاست میں اُردو کو اس کا جائز مقام دینے کے لیے مطالبات جاری تھے۔ حکومت نے اُردو کو دوسری زبان تو قرار نہ دیا مگر چند ایسی مراعات ضرور دے دیں جس سے اُردو والوں کی ہمت افزائی ہوئی اور اس کی بنیاد پر بہار، یوپی اور دہلی میں اُردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دیا گیا۔

بہار دراصل ملک کی پہلی ریاست ہے جس میں اُردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا گیا برسوں کی کوششوں کا یہ مثبت نتیجہ نکلا کہ اُردو کی مخالفت کرنے والے بڑی حد تک مطمئن ہو گئے کہ اگر اُردو کو دوسری زبان کی حیثیت ملتی ہے تو اس سے ہندی زبان کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ قانون پاس ہوئے مگر اس کے خلاف کوئی تحریک وجود میں نہ آئی۔ یہ کہنا یقیناً درست نہ ہوگا کہ اس حیثیت کو پانے کے بعد اُردو کو اس کا جائز حق مل گیا مگر اس سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ حکومت کے ایوانوں سے یہ پہلا جرات مندانہ قدم تھا۔ اس کوشش میں انجمن ترقی اُردو (ہند) کی ریاستی شاخ نے نمایاں خدمات انجام دیں۔

یوپی میں بھی اُردو کو دوسری سرکاری زبان بنا دینے کا قانون منظور ہو گیا مگر مخالفین نے اسے عدالت میں چیلنج کر دیا۔ اب یہ مسئلہ سپریم کورٹ میں زیرِ غور ہے۔

دہلی میں حکومت نے پنجابی اور اُردو دونوں زبانوں کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا اعلان کیا اور جلد ہی اس سلسلہ میں ایک بل بھی پاس کر دیا۔ ضابطے کے مطابق اسے لیفٹننٹ گورنر کی منظوری درکار ہے مگر تقریباً دو سال گذرنے کے بعد بھی آج تک منظوری نہیں مل سکی ہے۔ چونکہ دہلی کو مکمل ریاست کی حیثیت حاصل نہیں ہے اس لیے لیفٹننٹ گورنر کو ہوم منسٹری سے رابطہ قائم کرنا ہوتا ہے۔ ہنوز یہ معاملہ تعطل میں ہے لیکن امید ہے کہ جلد ہی یہ منظوری حاصل ہو جائے گی۔

اقلیتی زبانوں کا کمشنر:

حکومتِ ہند نے لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تشکیلِ نو کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا۔ جس نے ۳۰ ستمبر ۱۹۵۵ء کو اپنی رپورٹ پیش کی جس کی بنیاد پر اگلے ہی سال یعنی ۱۹۵۶ء میں ریاستوں کی تشکیلِ نو ہوگئی اس رپورٹ پر عمل درآمد کرنے کے لیے دستور میں ترمیم کرنی پڑی اور دفعہ ۳۵۰ (الف) اور (ب) کا اضافہ کرنا پڑا۔ دفعہ ۳۵۰ (ب) کے تحت لسانی اقلیتوں کے مفاد کے لیے کمشنر فار لنگوسٹک مائنارٹیز کا تقرر عمل میں آیا۔ پہلا کمشنر ۳۰ جولائی ۱۹۵۷ء میں مقرر ہوا جس نے اپنی سالانہ رپورٹ ۲۳ دسمبر ۱۹۵۷ء میں پیش کی جو بعد میں پارلیمنٹ میں پیش ہوئی۔ اس

www.taemeernews.com

کمشنر کا کام ہے کہ لسانی اقلیتوں کے تمام لسانی مسائل پر غور کرے، مشکلات کو دور کرے اور پارلیمنٹ کو کی گئی کارروائی سے آگاہ کرے۔ چند سال تک تو برابر سالانہ رپورٹ آتی رہی۔ پارلیمنٹ میں پیش ہوتی رہی، مگر پھر اس کام میں تساہلی آ گئی۔ اُدھر کچھ سال سے اس کمیشن کی رپورٹ نہیں آئی اور نہ اس کو ایسی کوئی تاکید ہی کی گئی۔ اس کمشنر سے یقیناً بہت توقعات تھیں اور اگر کوئی اچھا کمشنر آجائے تو بہت سے کام ممکن بھی ہیں حالانکہ اکثر یہ شکایتیں ملتی ہیں کہ ریاستی حکومتیں اس سے بالکل تعاون نہیں کرتیں اور مطلوبہ اطلاعات فراہم نہیں کرتیں۔

قومی کونسل برائے ترقی اُردو زبان:

حکومتِ ہند کی وزارت تعلیم کے تحت چلنے والے خواختیار ادارے ''قومی کونسل برائے ترقی اُردو زبان'' نے گذشتہ چند برسوں میں قابلِ فخر کام کیا ہے۔ دراصل یہ کونسل بیورو فار پروموشن آف اُردو کی قائم مقام ہے لیکن اب اس کے اختیارات کا دائرہ کافی وسیع ہو گیا ہے اور حکومت ہند سے اس کو اچھی رقم بطور گرانٹ ملتی ہے۔ کونسل ملک کا واحد ادارہ ہے جو مختلف انداز سے اُردو کی خدمت کرتا ہے۔ درسی اور غیر درسی کتب، بچوں کے لیے خصوصی طور پر تیار کی ہوئی کتب، بڑے پیمانے پر بچوں کی کتابوں کا انگریزی سے ترجمہ، کمپیوٹر کے ذریعہ کتابت، فاصلاتی اُردو کورس، دوسرے اداروں کی مدد، کتابوں کی نمائش، گشتی کتب خانہ، گشتی سیل ڈپو غرض تقریباً ہر ممکن زاویے سے اُردو کی خدمت کرنے والا کافی مقبول ہے ادارہ اور نہایت مفید کام انجام دے رہا ہے۔

اُردو اکادمیاں:

تقریباً ہر اُس ریاست میں اُردو اکادمی قائم ہے جہاں اُردو بولنے والے ہیں۔ ان اکادمیوں نے گذشتہ دو دہوں میں اُردو کی ترویج اور بقا میں قابلِ تعریف کام کیا ہے۔ تقریباً سبھی اکادمیاں کتب اور رسائل شائع کرتی ہیں۔ شاعروں اور ادیبوں کو اپنی تصنیفات شائع کرنے کے لیے امداد دیتی ہیں۔ ضرورت مند شعراء، ادیبوں اور مصنفین کو وظائف دیتی ہیں۔ مشاعرے اور سمینار کراتی ہیں۔ نادر کتب کی اشاعتِ نو میں دلچسپی لیتی ہیں۔ تعلیمی مقابلے کر کے لائق طالب علموں کو وظائف دیتی ہیں۔

چونکہ ساری اکادمیاں ریاستی سطح پر کام کرتی ہیں، اس لیے اس کے امکانات رہتے ہیں کہ یہ

www.taemeernews.com

ایک دوسرے کے کاموں سے واقف نہ ہوں اور دو یا دو سے زیادہ اکادمیاں ایک ہی کام انجام دیں۔ مثلاً نادر کتب شائع کریں۔ ایسی صورت میں وقت اور رقم کا بے جا صرفہ ہوسکتا ہے۔ اس امکان کو ختم کرنے کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان برابر ان اکادمیوں کا مشترکہ اجلاس بلاتی ہے تاکہ یہ اپنے پروگراموں کا جائزہ لے سکیں اور دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھا سکیں۔

فاصلاتی کورس:

پورے ملک کو تعلیم کے دائرے میں لانا بہت مشکل اور خرچیلا کام ہے۔ آج دنیا بھر میں فاصلاتی کورس قائم کیے گئے ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی نیشنل اوپن اسکول اور اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی اس خدمت کو انجام دے رہی ہے۔ ان اداروں کے ذریعے سے اب اُردو کے اسباق بھی طالب علموں تک پہنچائے جارہے ہیں۔ یہ ادارے طالب علموں کے لیے درسی کتب بھی تیار کراتے ہیں۔ حسب ضرورت سال میں مختلف مواقع پر ان کے Contact کلاس بھی کراتے ہیں جس میں طالب علموں کو اپنے مسائل حل کرنے کا موقع بھی مل جاتا ہے۔

اوپن اسکول نے حال میں انجمن ترقی اُردو (ہند) سے رابطہ قائم کر کے درجہ تین، پانچ اور آٹھ کا امتحان اُردو سے لینے کے لیے انجمن کو ذمہ دار قرار دیا ہے۔ انجمن نے درجہ پانچ کے لیے درسی کتاب بھی ترتیب دی ہے۔ جلد ہی دہلی کی سطح پر یہ کام شروع کیا جائے گا اور پھر اسے کل ہند سطح پر چلانے کا منصوبہ ہے۔

دور درشن اُردو نیوز بلیٹن:

ریڈیو پر اُردو کے پروگرام بہت لمبے عرصے سے آرہے تھے۔ دور درشن پر بھی اُردو کے پروگرام آنے شروع ہوگئے تھے مگر اُردو والوں کا عرصہ سے یہ مطالبہ چلا آرہا تھا کہ اُردو میں خبریں بھی ٹیلی کاسٹ کی جائیں۔ جب یہ مطالبہ اس زمانے کی ریاستی وزیر گرجا دیاس کے سامنے پیش ہوا تو وہ افسران کے اختلاف کے باوجود اس کے لیے رضامند ہوگئیں۔ وہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

اُردو کا فروغ:

اُردو دانشور اور اُردو انجمنیں سرکار کی ان تمام کوششوں سے مطمئن نہیں ہیں۔ کچھ حضرات ہمیشہ

www.taemeernews.com

اس خطرے کی بات کرتے ہیں جو بقول ان کے اُردو کو درپیش ہے مگر کچھ ایسے حضرات بھی ہیں جو باوجود یہ کہ ان کوششوں اور کاوشوں سے مطمئن نہیں ہیں، یہ خیال رکھتے ہیں کہ گذشتہ دو دہوں میں امید افزا ترقی ہوئی ہے اور اُردو کا مستقبل تابناک ہے اور کم از کم مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اگر ہم اُردو کے منظرنامے پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو ہمیں ہر طرف مشاعرے، مذاکرے، ڈرامے، رسالے، روزنامے، تقسیم انعامات اور وضائف کے جلسے، تعلیمی مقابلے وغیرہ نظر آتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ صورتِ حال ہمیں مطمئن کرسکتی ہے؟ کیا ہمارے مقاصد کو پورا کرسکتی ہے؟ کیا یہ اُردو کے مستقبل کو تابناک بنا سکتی ہے؟ شاید نہیں، شاید ہرگز نہیں۔

ہمیں اُردو کا دامن یقیناً سمٹتا ہوا نظر آرہا ہے۔ ہمارا دیرینہ مطالبہ ہے اور جائز مطالبہ ہے کہ ایسے بچوں کو پرائمری سطح کی تعلیم اُردو زبان میں دی جائے جن کے والدین اپنی مادری زبان اُردو درج کرائیں۔ اگر ابتدائی تعلیم مادری زبان میں نہ دی گئی تو وہ دن بہت دور نہیں ہے جب ہماری آنے والی نسلیں اس زبان سے بہت دور ہو جائیں گی۔ کچھ ریاستوں میں سرکار کی طرف سے ایسے اسکول کھولے گئے ہیں جن میں ابتدائی تعلیم اُردو کے ذریعہ ہوتی ہے لیکن تکلیف دہ حقیقت یہ ہے کہ اکثر ایسے اُردو اسکولوں میں یا تو اساتذہ کی بے حد کمی ہوتی ہے یا ایسے اساتذہ کا تقرر کردیا جاتا ہے جو اُردو سے نابلد ہوتے ہیں۔ یو. پی میں ایسے اساتذہ کا تقرر ہوگیا جن کا نام احمد علی یا محمد علی تھا مگر محض نام سے کیا؟ ایسے بے شمار ٹیچر منتخب کرلیے گئے جو اُردو کی کوئی اہلیت نہ رکھتے تھے اور پھر بعد میں ان اساتذہ کو مختلف مضامین پڑھانے کو دے دئے گئے یا ان کا تبادلہ ایسے اسکولوں میں کردیا گیا جہاں اُردو استاد کی ضرورت ہی نہ تھی۔

سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری کی سطح پر سہ لسانی فارمولا اس انداز سے نافذ کیا گیا کہ بچوں کو اُردو پڑھنے کا موقع ہی نہ تھا، کہیں انھیں سنسکرت پڑھنی پڑتی ہے تو کہیں جنوبی ہند کی کوئی زبان مگر اُردو وہ صرف اس صورت میں پڑھ سکتے ہیں کہ وہ یا تو انگریزی چھوڑیں یا ہندی، ایسا کیوں کر ممکن ہے۔ اس لیے والدین اپنے بچوں سے اُردو ہی چھڑوا دیتے ہیں۔

وزرائے اعلیٰ نے اپنی ۱۹۶۱ء کی کانفرنس میں درج ذیل سہ لسانی فارمولا منظور کیا تھا۔

۱۔ علاقائی زبان اور مادری زبان، جب مادری زبان علاقائی زبان سے مختلف ہو۔

۲۔ ہندی یا ہندی کے علاقے میں کوئی دوسری ہندوستانی زبان

۳۔ انگریزی یا کوئی دوسری یورپین زبان

www.taemeernews.com

کوٹھاری کمیشن (۶۶۔۱۹۶۴) نے اس سہ لسانی فارمولے میں کچھ نقائص پائے اور خود اپنی تجویز پیش کی۔ ۱۹۶۸ کی قومی تعلیمی پالیسی نے اور بعد میں قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶ نے مندرجہ ذیل فارمولا تجویز کیا:

۱۔ ہندی کے علاقے میں سہ لسانی فارمولے کے تحت ہندی، انگریزی اور ایک جدید ہندوستانی زبان (بہتر ہو کہ وہ زبان جنوبی ہند کی ہو)

۲۔ غیر ہندی علاقے میں ہندی، انگریزی اور علاقائی زبان۔

لسانی کمشنر نے اس فارمولے پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ غیر ہندی علاقے میں نتیجے کے طور پر بچے کو چار زبانیں پڑھنی پڑتی ہیں۔

گجرال کمیٹی نے سب سے زیادہ قابل قبول سہ لسانی فارمولا پیش کیا تھا۔ اس سے اُردو اور ہندی والوں کو کوئی زحمت نہ ہوئی اور سنسکرت کی تعلیم بھی جاری رہتی مگر معمولی ترمیم کے ساتھ ۱۹۸۶ کے فارمولے پر ہی سب جگہ عمل ہو رہا ہے۔

جعفری کمیٹی نے پوری تحقیق کے بعد لکھا ہے کہ یوپی میں حکومت کی طرف سے ایک بھی اردو میڈیم اسکول کام نہیں کر رہا ہے۔ اس کمیٹی کے مطابق ریاست میں ۱۳۷۰ اُردو میڈیم پرائمری اسکول تھے جب کہ اُردو بولنے والی آبادی ۱۰،۷۶۷،۱۷۰ افراد پر مشتمل تھی۔ دراصل یہ اسکول پہلے اسلامیہ پرائمری اسکول کہلاتے تھے اور یہ جزوی سرکاری امداد سے چل رہے تھے۔ اب ان کو گورنمنٹ گرانٹ سے چلایا جا رہا ہے اور انھیں اردو میڈیم پرائمری اسکول کا نام دیا گیا ہے۔

بہار، آندھرا پردیش، کرناٹک اور خصوصیت سے مہاراشٹر میں اُردو میڈیم اسکولوں کی حالت بہت بہتر ہے۔ تعداد بھی کافی ہے، انتظام بھی مناسب ہے، یوپی میں سرکاری اسکولوں کے نہ ہونے کی وجہ سے وہاں کے مدارس بہت کام کر رہے ہیں لیکن چند سال سے ایک خاص زاویے کے خیالات رکھنے والے سیاست دانوں نے ان مدارسوں کو اپنا ہدف بنایا ہے۔ ان کے مستقبل پر اب سوالیہ نشان بنا دیا گیا ہے۔ ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی حکومت ہند کی وزارت تعلیم کی مدد سے مدارس کو عصری تعلیم کی طرف راغب کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں مدارس کے اساتذہ کے دو سمینار ہو چکے ہیں اور ابھی ان کا یہ منصوبہ جاری ہے۔

وسائل اور امکانات:

پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو کے فروغ، ترویج اور بقا کے لیے وسائل بھی

www.taemeernews.com

موجود ہیں اور امکانات بھی ہیں مگر کمی ہے تو صرف نیت کی۔

ہمارا سب سے بڑا وسیلہ ہے ہمارا دستور، دستور میں پوری وضاحت سے اقلیتوں کے لسانی حقوق اور ان کے تحفظات کی بات کہی گئی ہے۔ جب تک دستور میں ترمیم کر کے ان دفعات کو کالعدم نہیں کیا جاتا، ان دفعات کے دائروں کو محدود یا بے اثر نہیں کیا جاتا، اس وقت تک مرکزی اور ریاستی حکومتیں، مقامی حکومتیں اور عہدہ داران اور حکام سب پابند ہیں کہ کہ وہ ان دستوری فرائض کو ادا کریں۔ لیکن ہمارا پچاس سالہ تجربہ بتاتا ہے کہ ہر سطح پر نیک نیتی اور حوصلے کا فقدان ہے۔

مالی وسائل کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ حکومت جس قدر رقم ایک میزائل کے تجربے پر لگاتی ہے، اتنی رقم سے پرائمری سطح پر اُردو پڑھانے والے اسکول قائم کیے جاسکتے ہیں۔ حکومت خلاء میں جانے کا منصوبہ منظور کرنے کو آمادہ ہے۔ یہی رقم سیکنڈری اور سینئر سیکنڈری سطح پر اُردو کی تعلیم کا بندوبست کرنے پر صرف کر کے اس مسئلہ کا حل کر سکتی ہے۔ ریاستی اکادمیاں حکومت سے گرانٹ حاصل کرتی ہیں۔ ان اکادمیوں کے فرائض میں اُردو تعلیم کا بندوبست بھی کر دیا جائے تو کم از کم اُردو اساتذہ کی کمی کا مسئلہ تو حل کیا ہی جاسکتا ہے۔ اُردو اکادمیوں کے دائرہ کار میں ریاستی حکومتوں کو اُردو کے مسائل سے واقف کرانے اور ان کے حل تجویز کرنے کا اضافہ کر دیا جائے تو جلد آدھے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

دورِ حاضر میں NGOs یعنی غیر سرکاری ادارے مختلف میدانوں میں قابلِ تعریف کام کر رہے ہیں۔ ہم بھی سر جوڑ کر بیٹھیں اور مقصد کو سامنے رکھ کر کام کریں تو بڑی حد تک کامیاب ہو سکتے ہیں لیکن حکومت کی سرپرستی کے بغیر کامیابی ممکن نہیں ہے۔ اسکول کون کھولے گا؟ نصاب کون تجویز اور منظور کرے گا؟ نصابی کتابیں کون تیار کرے گا؟ امتحانات کون بورڈ یا یونیورسٹی لے گی؟ ان اسناد کی منظوری کون دے گا؟ ملازمتوں میں کون ان صلاحتوں پر غور کرے گا؟ یہ اور ایسے بے شمار سوال اٹھ سکتے ہیں۔

ہمارے کچھ دانشور کہتے ہیں کہ ہم حکومت پر انحصار کرنا چھوڑ دیں اور خود اپنے طور پر اُردو کی بقا اور ترویج کا منصوبہ بنائیں۔ اپنے بچوں کو گھروں پر اُردو پڑھائیں۔ جی ہاں، یہ بالکل ممکن ہے، ایک قوم نے بڑے لمبے عرصے تک مختلف حکومتوں کے مظالم برداشت کیے۔ ان کی عدم دلچسپیاں برداشت کیں مگر خود اپنے طور پر اپنی تہذیب اور زبان کی بقا کے لیے سرگرم کوششیں کیں اور آج وہ اپنی حکومت قائم کر کے اپنی زبان کی سرپرستی بھی کر رہے ہیں۔ بالکل بجا لیکن وہ

www.taemeernews.com

حالات اور تھے۔ ان کے مسائل اور تھے، ہمیں دوسرے حالات سے نبرد آزما ہونا ہے، اور حکومت سے ہم تقاضے کیوں نہ کریں، دستور ہم سے وعدہ کرتا ہے، ہم بھی سرکار کو ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ ہم بھی اسی ملک کے شہری ہیں۔ ہم نے بھی آزادی کی طویل جنگ میں جان اور مال کی قربانی دی ہے۔ ہم آج بھی ملک کی خدمت پورے انہماک، جوش وخروش اور خلوص سے کر رہے ہیں۔

شاید حکومت کی لاپرواہیوں اور عدم توجہات کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنی بات اس زور وشور اور طریقے سے نہیں کہہ رہے ہیں، جتنی شدت سے ہمیں کہنی چاہیے۔ اپنے مطالبات میں مزید طاقت اور جاں فشانی کی ضرورت ہے یقین ہے کہ ہم ایک دن ضرور کامیاب ہوں گے۔ اس کا واحد مگر قابل غور اعتراف حکومت ہند نے خود کیا ہے۔ ۱۴ر جولائی ۱۹۵۸ء کے لسانی اعلانیہ کے پہلے پیراگراف کو ایک بار پھر غور سے پڑھنے کی ضرورت ہے:

> ''انجمن ترقی اُردو (ہند) نے بہت سے میمورنڈم حکومت کو پیش کیے تھے، جن میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ اُردو کو مختلف علاقوں میں جہاں اس کے بولنے والوں کی معتدبہ تعداد ہے، سرکاری طور پر منظوری دی جائے۔ خاص طور پر اس پر زور دیا گیا تھا کہ اُردو میں تعلیم اور امتحانات کے پورے مواقع فراہم کیے جائیں۔ ان میمورنڈم کو دیکھنے اور دوسرے ذرائع سے معلومات حاصل کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس سلسلے میں کافی غلط فہمیاں ہر سطح پر ہیں۔ اس لیے ضروری محسوس کیا جاتا ہے کہ اس غلط فہمی کو دور کیا جائے اور اُردو کی وہ حیثیت جو دستورِ ہند میں پیش کی گئی ہے اور جس طرح کے گورنمنٹ نے اعلان کیے ہیں اور جیسا کہ ریاستی حکومتوں کی وزارت تعلیم کی کانفرنس میں طے ہوا ہے، اس کو ایک بار پھر پیش کیا جائے اور واضح کر دیا جائے''۔

مندرجہ بالا پیراگراف میں صاف طور پر اعتراف کیا گیا ہے کہ:

۱۔ حکومت نے انجمن ترقی اُردو (ہند) کے میمورنڈمز کو قابل اعتبار سمجھا۔

۲۔ حکومت نے دوسرے ذرائع سے بھی اطلاعات لیں۔

۳۔ حکومت نے دستور ہند کی وضاحت کا احترام کیا۔

www.taemeernews.com

۴۔ حکومت ہند نے ریاستی حکومتوں کے وزارت تعلیم سے بھی مشورہ کیا۔
۵۔ حکومت نے ضرورت محسوس کی کہ غلط فہمیوں کو دور کیا جائے (اب وہ غلط فہمی ہے یا صحیح فہمی، فی الوقت اس پر بحث نہ کریں)۔
۶۔ حکومت نے اپنا موقف واضح کرنا ضروری سمجھا۔

بس ہم اپنی مہم تیز سے تیز کردیں۔ مطالبات کو موثر انداز سے پیش کریں۔ میڈیا کو ساتھ رکھیں۔ صحافیوں کی ہمدردیاں حاصل کریں بااثر اور پروقار شخصیتوں کو اپنا ہم نوا بنائیں۔ منظم طور پر تحریک چلائیں۔ اگر دوٹ کی سیاست، کوئی سیاست ہے تو موقع غنیمت ہے، آج سے اور ابھی سے پرسکون، پروقار، منظم اور پرخلوص تحریک شروع کریں اور اس عزم اور یقین کے ساتھ کہ ہماری آواز حکومت کے ایوانوں میں قابل اعتنا سمجھی جائے گی۔

●●●

www.taemeernews.com

ڈاکٹر جمیل اختر

اُردو لغات اور فرہنگ سازی کے مسائل

لغت نویسی دنیا کے مشکل ترین کاموں میں ایک ہے۔ اس کام کے لیے مرتب ذہن، سائنسی و تحقیقی مزاج، دوررس نگاہ اور علم و دانش کے ساتھ ساتھ صبر و تحمل کی بھی ضرورت ہے۔ جس شخص کے اندر یہ تمام خصوصیات موجود ہوں گی وہی شخص لغت سازی کے تقاضوں کو کسی حد تک پورا کرسکتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس کام کے لیے جس وافر علم یعنی علوم پر دسترس اور نگاہ دوربیں کی ضرورت ہے اس کا کسی ایک شخص کے اندر مکمل طور پر ہونا ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک اُردو کی جتنی بھی لغات تیار ہوئی ہیں وہ خامیوں سے پاک نہیں ہیں۔ سب کی اپنی خوبیوں اور انفرادیت کے باوجود اس میں علمی، تحقیقی، سائنسی اور الفاظ کے اندراج کی سطح پر بہت سی خامیاں موجود ہیں۔ محاورے اور روزمرہ بول چال کے بہت سے الفاظ آج بھی ان لغات میں موجود نہیں ہیں۔

دوسری بڑی خامی ان لغات میں علاقائی اثرات کی بھی ہے۔ فرہنگِ آصفیہ اپنے تمام تر دعووں کے باوجود دہلویت کے اثرات سے باہر نہیں نکل سکی ہے۔ نور اللغات دبستان لکھنو کی ترجمانی کرتی ہے۔ ان دونوں لغات کی طباعت کے بعد ۱۹۳۵ء میں لاہور پنجاب کے خواجہ عبدالمجید نے جامع اللغات کے نام سے ایک ضخیم لغت چار جلدوں میں مرتب کی جس پر لاہوریت حاوی ہے۔ چونکہ ان کی مادری زبان اُردو نہیں تھی دوسرے ان کا تعلق دہلی یا لکھنو سے

www.taemeernews.com

نہیں تھا اس لیے اہل لکھنؤ یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے کہ کوئی فردِ واحد اور وہ بھی پنجابی کس طرح ایسی لغت ترتیب دے سکتا ہے۔ لہٰذا یوپی اور پنجاب کے اُردو دانوں، ادیبوں اور شاعروں میں ادبی جنگ شروع ہوگئی۔ اودھ پنچ میں لکھنو کے ادبا'' خاکساران لکھنؤ'' کے نام سے پنجاب کے ادیبوں پر پھبتیاں کسنے لگے یہاں تک کہ انہوں نے اقبالؔ اور آغا حشر کاشمیری کو بھی نہیں بخشا۔ لاہور سے'' زندہ دلان لاہور'' کے نام سے ان اعتراضات کا جواب دیا جانے لگا۔ جواب لکھنے والوں میں مولانا عبدالمجید سالک، پطرس بخاری، امتیاز علی تاج اور صوفی غلام مصطفےٰ تبسم شامل تھے۔ اس ادبی مجادلے میں جامع اللغات پر بھی خوب لے دے ہوئی جس سے اس لغت کو کافی نقصان پہنچا اور شہرت بھی ملی۔

لکھنؤ اور دہلی والے زبان کے معاملے میں کب کسی کو خاطر میں لاتے تھے۔ وہ لوگ تو اپنے علاوہ کسی کو عالم فاضل سمجھتے ہی نہیں تھے۔ بھلا ایسی صورت میں وہ دونوں یہ کیوں کر گوارا کر سکتے تھے کہ ان کی زبان دانی اور علم دانی کسی ایسے شخص کے ذریعے ہیچ وحقیر قرار پائے جو نہ لکھنؤ کا ہے اور نہ جس کی مادری زبان ہی اُردو ہے۔ اس لیے کہ جامع اللغات کے شائع ہونے کے بعد ان لغات کی کمیاں اور خامیاں عوام کے سامنے آگئی تھیں اور لوگ ان دونوں لغات کے مقابلے میں جامع اللغات کو ایک بہتر لغت تصور کرنے لگے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگیا۔

جامع اللغات کی مقبولیت کا اندازہ آپ اس بات سے بھی لگا سکتے ہیں کہ اُسی زمانے میں نظام حیدرآباد نے بھی اُردو کی ایک اعلیٰ اور علمی لغت کی ترتیب وتدوین کے لیے جید علما کا ایک بورڈ قائم کر رکھا تھا جو دس بارہ سال سے یہ کام کر رہے تھے۔ مگر جب جامع اللغات نظام کی خدمت میں پیش کیا گیا تو وہ اُسے دیکھ کر دنگ رہ گئے اور اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً اپنے یہاں کام رکوا دیا اور جامع اللغات کو حیدرآباد کی تمام لائبریریوں، اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں پہنچا دیا۔

اس قضیے کا تعلق بھی چونکہ لغت نویسی کے مسائل سے ہے اس لیے اس کا تفصیلی ذکر میں نے یہاں کیا ہے۔ پہلی دونوں لغات کے مرتبین کا تعلق اُردو داں طبقے سے تھا۔ جب کہ جامع اللغات کے مرتب کا تعلق اُردو داں طبقے سے نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود جامع اللغات کو کافی شہرت ملی اور ان لغات کی موجودگی میں زیادہ مستند قرار پائی۔ لہٰذا اس سے یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ صرف

www.taemeernews.com

اہل زبان ہونا کافی نہیں بلکہ مختلف زبانوں اور علوم وفنون سے واقفیت کے ساتھ ساتھ زباں داں بھی ہونا چاہیے اور اگر انشا کی طرح کئی زبانوں پر عبور حاصل ہو تو سونے پر سہاگا۔

صاحب جامع اللغات کا اپنا مضمون یوں تو ریاضی تھا لیکن وہ فزیکل سائنس، فلکیات، تاریخ، جغرافیہ، مذہبیات، موسیقی، علم نجوم اور بیت دانی میں بھی خاصی مہارت رکھتے تھے اور یہ تمام علوم تدوین لغت میں ان کے کام آئے۔ جب کہ فرہنگ آصفیہ اور نور اللغات کے مرتبین صرف اہل زبان تھے عصری علوم سے ان کی واقفیت برائے نام تھی جب کہ لغت نویسی کے لیے ہمہ داں ہونا ضروری ہے۔

اُردو لغات سازی میں خامیوں کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اُردو میں اب تک جتنی بھی لغات ترتیب دی گئی ہیں وہ فرد واحد کی کاوشوں کا نتیجہ رہی ہیں۔ لہٰذا ان کی ترتیب وتدوین کے اصول وضوابط بھی خود فرد واحد کے وضع کردہ ہیں اور سبھوں نے لغت کے معیار کو اپنی اپنی میزان پر تولا ہے۔ موجودہ لغات سے استفادے کے باوجود ایسا کوئی معیار مقرر نہیں کیا گیا جس کی پابندی لغت نویس کے لیے لازمی ہوتی۔ ایک تو آج تک یہ بات ہی طے نہیں ہو پائی ہے کہ لغت میں کیا کچھ ہونا چاہیے اور کیا کچھ نہیں، دوسرے معیاری اُردو لغت کا معیار کیا ہونا چاہیے۔ جب تک اصول وضوابط طے نہ کر لیے جائیں کسی بھی لغت کو ہم معیاری لغت نہیں کہہ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو میں درجنوں لغات کی موجودگی کے باوجود معیاری اُردو لغت کی کمی ہمیں شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ یہ کمی ہمیں الفاظ کے انتخاب، ان کے معنی، ان کے تلفظ، ان کی املا، محاوروں کے انتخاب، روزمرہ، علاقائی زبانوں کی شمولیت، تذکیر وتانیث کے تعین، نئے الفاظ کے اندراج، مختلف علوم وفنون کی اصطلاحات، دفتری زبان کا اندراج، عام بول چال کے الفاظ، سبھی سطحوں پر دیکھنے کو ملتی ہیں۔ کسی بھی اُردو لغت میں تمام علوم وفنون کے الفاظ و اصطلاحات کا مکمل احاطہ نہیں کیا گیا ہے اور نہ یہ کسی فرد کی بات ہی ہے۔

ایک بڑا مسئلہ متروکات کا بھی ہے۔ آج تک یہی طے نہیں ہو سکا کہ متروکات بھی کوئی چیز ہے اور کون کون سے الفاظ متروک قرار دیے جا سکتے ہیں اور کون کون سے نہیں۔ اس کام کو سبھی لغت نویس نے اپنی اپنی صوابدید کے مطابق انجام دیا ہے اور کچھ لغت نویس لفظ کو متروک قرار دینے کے حق میں نہیں ہیں۔ جامع اللغات کے مرتب خواجہ عبدالمجید متروکات کو کلی طور پر رد نہیں کرتے۔ ان کے خیال میں اُردو زبان کے کسی بھی ارتقائی مرحلے میں ان مردہ الفاظ کو حیات نو

www.taemeernews.com

مل سکتی ہے۔ان کا کہنا ہے:

''متروک الفاظ کولغت سے نکال دینا میری رائے میں قرین عقل و دانش نہیں کیونکہ متروک الفاظ کی مثال ان بیجوں کی ہے جو مردوں کی طرح زمین میں مدفون سو رہے ہیں لیکن جب وقت اور موقع آتا ہے اُنہیں خشک اور بظاہر مردہ بیجوں میں سے ہری ہری کونپلیں پھوٹ کر فضائے عالم میں شجر بن کر اپنی شاخیں پھیلا دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے کہ جب ہم شعرائے قدیم یعنی ولی دکنی، میر، سودا اور دیگر اساتذہ کی تصانیف کا مطالعہ کرتے ہیں تو متعدد اور بیش تر مواقع ایسے آتے ہیں جہاں متروک الفاظ نادر اسالیب، نرالی تراکیب اور غریب بندشیں آجاتی ہیں۔ جن کے سمجھنے والے کے لیے لغت کے سوا اور کہیں جائے پناہ نظر نہیں آتی''۔

(جامع اللغات صفحہ ۱۲)

فیروز اللغات کے مطابق:

''صرف وہ متروک الفاظ و محاورات شامل کیے گئے ہیں جن کا اگر چہ چلن نہیں ہے مگر قدیم کتابوں میں پائے جاتے ہیں''۔ صفحہ ا

لہٰذا متروک اور غیر متروک الفاظ کی نشاندہی اور ان کے اندراج کا معاملہ بھی خاصا الجھا ہوا ہے اور پیچیدہ کام ہے۔ زیادہ تر لغت نویس متروکات کو درج کرنے کے حق میں ہیں اس لیے کہ وہ اسے زبان کے ارتقائی سلسلے کی ایک کڑی سمجھتے ہیں اور قدیم دواوین اور نثر پارے کے مطالعے اور ان کی تفہیم و تشریح کے لیے ان الفاظ کی لغت میں موجودگی ضروری قرار دیتے ہیں۔ یہ اصول کی بات ہے، خود انگریزی لغت نویسی جو انتہائی ترقی یافتہ فن ہے اس کی لغات میں بھی قدیم الفاظ شامل ہیں اور ان کے لیے اصطلاح ہے آرکا کیٹک (Architect)

ایک مسئلہ تلفظ کا بھی ہے۔ ایک لفظ کے کئی کئی تلفظ مروج ہیں اور وہ لغت میں درج ہیں۔ تلفظ کا مسئلہ علاقائی اثرات کی وجہ سے بھی پیدا ہوا ہے اور آج تک بعض الفاظ کے تلفظ کے سلسلے میں کوئی حتمی معیاری تلفظ مقرر نہیں کیا جا سکا ہے۔ خود انگریزی میں ایس کا تلفظ اب زیڈ ہونے لگا ہے۔ شیڈیول اور اسکیڈیول رائج ہیں۔ ایمی جیٹ اور امیڈیٹ اور اوفٹن اور اوفن وغیرہ بھی رائج

www.taemeernews.com

ہیں۔ کسی بھی معیاری زبان کے لیے تلفظ کے معیار کا تعین بے حد ضروری ہے۔

الفاظ کے املا کا مسئلہ بھی ہنوز حل طلب ہے۔ آج بھی لغات کے اندر ایک لفظ کے مختلف املے درج ہیں۔ اُردو املا کی معیار بندی کے سلسلے میں بھی لغت نویسوں نے کوئی پیش رفت نہیں کی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ اور رشید حسن خاں کی املا سفارشات کے باوجود لغات کے جدید ایڈیشنوں میں اس کا التزام نہیں برتا گیا اور ناشرین پرانی لغات کے عکس در عکس چھاپتے رہے اور خامیاں اپنی جگہ برقرار رہیں۔

املا کے سلسلے میں یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رکھنے کی ضرورت ہے کہ سب سے اہم چیز لفظ کی صورت نگاری ہے، ایسی اصلاح املا میں قابل قبول نہیں ہوسکتی جس کی وجہ سے عہدِ حاضر کے لوگ ماضی میں لکھی اور چھپی ہوئی کتابیں نہ پڑھ سکیں۔

لغت کے لیے الفاظ کے انتخاب کا مسئلہ بھی بے حد اہم ہے۔ اس لیے کہ ماضی میں ترتیب دی گئی لغات اور آج کی مرتب کردہ لغات میں بہت بڑا فرق ہے۔ اُردو کی قدیم فرہنگیں خاص نقطۂ نظر کے تحت لکھی گئی تھیں۔ اس وقت ہندوستان میں فارسی کا رواج تھا اور اُردو اپنے ابتدائی دور سے گذر رہی تھی۔ ان لغتوں میں اُردو الفاظ کے معنی فارسی میں لکھے گئے ہیں تاکہ فارسی جاننے والوں کو مقامی زبان سمجھنے میں آسانی ہو۔ اس کے بعد انگریزوں کا زمانہ آیا۔ ہندوستان پر جب ان کا تسلط پورے طور پر ہوگیا اور ان کے عملے پورے ملک میں پھیل گئے تو ان کو ہندوستانی زبان سیکھنے کی ضرورت ہوئی۔ اس ضرورت کے پیشِ نظر انگریز مولفین نے فرہنگیں تالیف کیں جو اُردو سے انگریزی میں تھیں۔ یہ سب فرہنگیں سوداگروں اور کمپنی کے عہدے داروں کو اُردو سکھانے کی غرض سے مرتب کی گئیں۔ یہاں مقصد اُردو کو ایک غیر ملکی زبان کی حیثیت سے سیکھنے کا تھا یعنی وہ لوگ اُردو سیکھ رہے تھے جن کی مادری زبان اُردو نہیں تھی لہٰذا یہاں الفاظ کے انتخاب کا معاملہ بھی بالکل مختلف نوعیت کا تھا۔

لیکن جب ڈپٹی نذیر احمد نے کرمنل پروسیجر کوڈ کا ترجمہ ''تعزیرات ہند'' کے نام سے کیا تو اُردو کی مخالفتوں کے باوجود سارے ملک کے انتظامیہ اور عدلیہ میں اُردو بنیادی زبان ہوگئی اور یہ آج بھی زندہ ہے۔

اس کے بعد وہ دور آیا جب اُردو سرکاری دفتروں میں مروج ہوگئی اور ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے بھی اس کا رواج ہوا تو ایسی لغتیں شائع کرانے کی طرف بعض ناشرین کا خیال گیا جو نصاب

www.taemeernews.com

کی ضرورتوں کو پورا کرسکیں۔ ان کی نوعیت ان لغتوں سے ایک حد تک مختلف تھی جو انگریزوں نے تیار کی تھیں۔ چونکہ یہ ایسے طلبا اور مدرسین کے لیے تھیں جن کی مادری زبان اُردو تھی اس لیے ان میں عموماً ان الفاظ کو حذف کر دیا گیا تھا جو روزمرہ بول چال میں مستعمل ہیں۔ یورپین مرتبین نے اپنے یہاں تمام الفاظ کا اندراج کیا تھا جو لغت کا قاعدہ ہے۔ ہندوستانی مرتبین کا زیادہ زور عربی اور فارسی کے الفاظ پر رہا کیونکہ وہی الفاظ پڑھنے پڑھانے میں مشکل معلوم ہوتے تھے اور انھیں کے معنوں کی تلاش میں لغتوں کے صفحے الٹے جاتے تھے۔ ایسی لغتوں میں فارسی اور عربی کے بہت سے ایسے الفاظ درج ہونے لگے جو اُردو میں استعمال ہی نہیں ہوتے۔ لیکن اہم لغتوں میں اُردو کے دیسی الفاظ کا ذخیرہ عربی فارسی الفاظ سے کہیں زیادہ ہے۔

اُردو کی باضابطہ لغات تصدق حسین رضوی کی ''لغات کشوری'' (1890) امیر مینائی کی ''امیر اللغات'' (92-1891) منشی جھمّن لال بدایونی ''لغات ہیرا'' (1907) لالہ رام کشن و منشی امیر چند کی ''اُردو لغات'' (1894) سید احمد دہلوی کی ''فرہنگ آصفیہ'' (1908) مولوی فیروز الدین کی فیروز اللغات (1921) مولوی نورالحسن کی ''نور اللغات'' (1924) عطر چند کپور اینڈ سنز کی ''تاج اللغات'' (1932) خواجہ عبدالمجید کی ''جامع اللغات'' (1933) محمد عبداللہ خاں کی ''فرہنگ عامرہ'' (1937) وغیرہ ہیں۔

بعد کی لغتوں میں نسیم امروہوی کی نسیم اللغات (1955) اثر لکھنوی کی ''فرہنگ اثر'' (1961) مہذب لکھنوی کی مہذب اللغات (16 جلدی۔ 79-1958) ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت فرہنگ آصفیہ کو نصیب ہوئی۔

درجِ بالا تمام لغات میں مولفین نے انتخاب الفاظ کے سلسلے میں اپنے علم، تجربے اور اپنی معلومات کی حد تک کچھ عصری علوم کے الفاظ کو اپنی لغت کے لیے منتخب کیا ہے۔ لہٰذا تمام حروف تہجی کے تحت جو اندراجات ہیں ان میں لغت کی ضخامت کے لحاظ سے کافی فرق ہے۔ لیکن ضخیم لغتوں کا بھی اگر موزانہ کریں تو الفاظ کے انتخاب کا طریقہ سبھوں میں مختلف پائیں گے۔ کوئی لفظ کسی کے لیے اہم ہے تو کوئی کسی کے لیے، معنی کی سطح پر بھی اختلاف ہے۔ تلفظ کا مسئلہ بھی گمبھیر صورتوں میں سامنے آتا ہے۔ اکثر لغات میں اعراب نہ ہونے کی وجہ سے لفظ کا صحیح تلفظ کرنا مشکل ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں تو تلفظ کا التزام ہی نہیں رکھا گیا ہے۔ نور اللغات، مہذب اللغات اور جامع اللغات میں اکثر الفاظ کے تلفظ اور فیروز اللغات میں تمام الفاظ کے تلفظ کی

www.taemeernews.com

نشاندہی کی گئی ہے۔ لیکن اس میں مختلف طریقے اپنائے گئے ہیں۔ کہیں اعراب کے ذریعے اور کہیں ہجائی تقسیم کے ذریعے۔

ان لغات میں الفاظ کے ماخذ لسانی یا مادے یا اصل سے متعلق بھی ان مولفین لغت کا نقطۂ نظر واضح نہیں تھا۔ اکثر لغات میں عربی الاصل مرکبات کو بے محابا فارسی قرار دے دینے کی روایت کا عام مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ مسعود ہاشمی کے نزدیک یہ ہے۔

> ''یہ حضرات ماخوذ لفظ کی اصل کی نشاندہی کے سلسلے میں اصل زبان اور وسیلے کی زبان کے درمیان امتیاز قائم نہیں کر سکتے تھے۔ فارسی کے وسیلے سے اُردو میں دخیل عربی الاصل الفاظ کو عربی سے ہی منسوب کرنے کی بجائے فارسی قرار دینے کی اس روش سے اس بات کی توثیق ہوتی ہے۔'' (لغت نویسی کے مسائل، صفحہ ۵۶۔۱۵۵)

یہی بات کمال احمد صدیقی نے مختصر طریقے سے یوں کہی ہے کہ:

> تقریباً عربی کے الفاظ مفرس ہونے کے بعد اُردو میں آئے ہیں کیونکہ اُردو سے پہلے فارسی رائج تھی اور عربی کے یہ الفاظ فارسی میں خاص طور سے شاعری میں رائج تھے''۔

لفظوں کے مآخذ لسانی کے ساتھ ساتھ ایک اور مسئلہ معنی کی سند کا بھی رہا ہے۔ سند یا فصاحت کے لیے صرف شعراء کے کلام کو ہی معیار بنایا گیا ہے جو کہ سرے سے غلط ہے اور اس سے کافی الجھنیں پیدا ہوئیں۔ بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو صرف نثر نگاروں نے استعمال کیے ہیں۔ شعراء نے نہیں ایسی صورت میں سند کے لیے شعرا کے علاوہ نثر نگاروں کا کلام بھی پیش کیا جانا چاہیے تھا۔ مالک رام کا کہنا ہے کہ:

> ''اُردو میں آج تک یہ روایت رائج رہی ہے کہ الفاظ کے معنی کی سند میں شعرا کا کلام پیش کیا جاتا رہا ہے۔ یہ طریقہ ناکافی اور ناقص تھا''۔

(لغت نویسی کے مسائل صفحہ ۱۶)

لیکن کیا کیجیے یہ ناقص طریقہ آج تک اُردو لغات میں رائج چلا آ رہا ہے۔ شعرا کے کلام کو حذف کر کے لغت کی ضخامت کو کم کیا جا سکتا تھا لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ ترقی اُردو بورڈ نے بھی

www.taemeernews.com

نوراللغات کی طباعت کے وقت سہل انگاری کی۔ چار جلدوں پر مشتمل اس لغت کی جب دو جلدیں ترقی اُردو بورڈ نے شائع کی تھی تو ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے اس کے اغلاط کی نشاندہی اپنے طویل مضمون میں کی تھی جو کئی قسطوں میں روزنامہ قومی آواز دلّی میں چھپا تھا۔ اس مضمون کی اشاعت کے بعد اس کے فروخت پر پابندی لگادی گئی اور اسے سرد خانے میں رکھ دیا گیا۔

نئے نظام کے تحت جب ۱۹۹۷ء میں ترقی اُردو بورڈ اُردو کونسل میں تبدیل ہوگیا تو اس لغت کو ۱۹۹۸ میں صحت نامہ کے اضافے اور ابتدائی ۳۶ صفحات کی تبدیلی کے بعد دونوں جلدوں کو فروخت کے لیے دوبارہ پیش کردیا گیا۔

ترقی اُردو بورڈ نے عکسی ایڈیشن شائع کرنے کی بجائے نئے سرے سے ان دو جلدوں کی کتابت کرائی اور جدید املا کو ترجیح دی۔ اغلاط کے راہ پاجانے کی وجہ سے اس کی بقیہ دو جلدوں کا عکسی ایڈیشن لانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اب اس کی دو جلدوں کی کتابت اور املا جدید ہے اور آخر دو جلدوں کی املا قدیم۔

یہ تو نوراللغات کا حشر ہوا۔ اب ذرا فرہنگِ آصفیہ کی حالتِ زار بھی ملاحظہ فرمایئے۔ عہد حاضر کے کئی بڑے محقق اور ناقد کے ذریعے اس کے اغلاط کی نشاندہی کے باوجود اس کے ایڈیشن پر ایڈیشن شائع ہورہے ہیں۔ فرہنگ آصفیہ کے اغلاط کی نشاندہی کے لیے شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون ''اُردو لغت اور لغت نگاری'' مسعود ہاشمی کی کتاب ''اُردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ'' اور قاضی عبدالودود کا تبصرہ فرہنگ آصفیہ جو خدا بخش لائبریری جرنل میں قسط وار شائع ہوا ہے ملاحظہ فرمائیں۔ اس لغت میں کون سے فحش الفاظ ایسے ہیں جو نہیں ہیں۔

اس لیے تدوین لغت کے سلسلے میں الفاظ کے انتخاب کا معاملہ خاصا اہم ہوتا ہے۔ لغت میں کیا کچھ ہونا چاہیے اور کیا نہیں اس کی تمیز بے حد اہم ہے۔ گالی نہ شرفا کی زبان ہے، نہ ادب کی، نہ ہی مہذب سماج کی پر اُسے لغت میں درج کرنے کا منطقی جواز کیا ہے۔

پروفیسر نذیر احمد کا کہنا ہے کہ:

> ''اُردو زبان کا یہ المیہ ہے کہ اب تک اس زبان کے الفاظ کے تعین کا مسئلہ قابل اطمینان حد تک طے نہیں ہوسکا ہے''۔ (لغت نویسی کے مسائل۔ صفحہ ۲۱)

میں نے پچھلے صفحات میں اُردو کی جن لغات کا ذکر کیا ہے فرہنگِ آصفیہ کو چھوڑ کر زیادہ تر

www.taemeernews.com

لغات کے مولفین کا تعلق لکھنو سے ہے۔ اُردو بولنے، پڑھنے اور لکھنے والے سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اُردو کا علاقہ پورا ہندوستان ہے۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ دنیا میں کوئی بھی زبان خالص نہیں ہوتی اس میں مختلف زبانوں کے الفاظ شامل ہوتے ہیں۔ شاید اس لیے ٹیگور نے کہا تھا کہ دنیا میں دو چیزیں کبھی خالص نہیں ہوتیں ایک خون دوسرے، زبان۔

دوسری زبانوں کی طرح اُردو میں بھی عربی، فارسی، ترکی، ہندی، سنسکرت، پرتگالی اور انگریزی زبانوں کے علاوہ ہندوستان کی علاقائی زبانوں اور بولیوں کے بہ کثرت الفاظ شامل ہیں، ہندوستان کی باقی تمام زبانوں کی طرح چاہے وہ آریائی ہوں یا دراوڑی۔ ایسا اس لیے بھی ہوا ہے کہ جن علاقاوں میں اسے استعمال کیا جاتا ہے وہاں کے مقامی الفاظ اس میں داخل ہو گئے ہیں۔ کیا آج اُردو میں پنجابی، ہریانوی، پشتو، کنڑ، تلگو، تامل، بنگالی، اودھی، مگھی، بھوجپوری اور میتھلی زبانوں کے الفاظ شامل نہیں ہوئے ہیں۔ لیکن کیا آج اُردو کی کوئی بھی لغت ایسی موجود ہے جس میں تمام زبانوں کے وہ الفاظ جو اُردو نے قبول کر لیے ہیں ان کا احاطہ کیا گیا ہو اور جو ہندوستان کے ہر علاقے کے لوگوں کے لیے قابل استفادہ ہو۔ اس کا جواب نفی میں ہے۔ اس کمی کو نور اللغات کے مولف مولانا نور الحسن نے بھی شدت سے محسوس کیا تھا لکھتے ہیں:

> ''مدت سے اس ضرورت کو محسوس کر رہا ہوں کہ اُردو زبان کا کوئی مکمل مستند لغت تیار ہو جائے جس سے اہل ملک کو فائدہ پہنچے۔'' (نور اللغات صفحہ ۱۶)

لیکن مولانا کی اس خواہش کی تکمیل آج تک نہیں ہو سکی۔ آج بھی اُردو کی کوئی لغت ایسی نہیں ہے جو ہر علاقے کے لوگوں کے لیے قابل قبول ہو۔ لکھنؤ اور دہلی کے حصار سے باہر نکل کر ہندوستان گیر پیمانے پر جب تک اس پر منتھن نہیں ہوگا مسئلے کا حل نہیں نکلے گا اور یہ کام کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں بلکہ قومی سطح پر ایک بڑے گروپ کے ذریعے جس میں ہر علاقے کے ایسے ماہرین شامل ہونے چاہییں جو مختلف علاقوں کی بولیوں اور زبانوں سے پوری واقفیت رکھتے ہوں۔ اس طرح ایک '' ہمہ گیر قومی اُردو لغت'' کی تدوین عمل میں آسکے گی اور تشنگانِ ادب کی پیاس بجھ سکے گی۔ یہ بات مکمل طور پر ذہن میں رہنی چاہیے کہ اُردو کی جامع و مکمل لغت وہی قرار پائے گی جو ہر علاقے کے لوگوں کے لیے قابل استفادہ ہو۔ اگر استفادہ کرنے والا اس کے ذریعے اپنے مسئلے کا حل تلاش کرنے میں ناکام رہتا ہے تو پھر یہ لغت اس کے لیے بے کار

www.taemeernews.com

ہے۔ لہٰذا تدوین لغت میں عام سے عام آدمی تک کا خیال رکھنا چاہیے۔ لغت صرف ادب کے پڑھانے کے لیے نہیں ہوتی۔ ہر پیشے اور ہر فن اور ہر علم اس کے دائرے میں ہونا چاہیے۔

اب آیئے معاملے کے دوسرے پہلو کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرائیں۔ اب تک میں نے جن لغات کا تذکرہ کیا ہے یہ تمام لغات فردِ واحد کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ اور انفرادی کوشش کا نتیجہ اکثر عیب دار ہوتا ہے۔ ان مولفین لغت کی علمی استعداد، زبان دانی، محاورہ شناسی ان کی اَن تھک محنت کے اعتراف کے باوجود یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ سائنسی طریقۂ کار کی بے حد کمی محسوس ہوتی ہے۔ انفرادی کوششوں سے الگ ہٹ کر اُردو میں لغت نویسی کے سلسلے میں کم از کم ہندوستان کی سطح پر کوئی بھی اجتماعی کاوش بڑے سرکاری اداروں کی موجودگی کے باوجود نہیں ہو رہی ہے۔ جبکہ ہندوستان جیسے کثیر لسانی ملک میں ایک ایسی اُردو لغت کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی ہے جس میں اُردو کے ذریعے اپنائے گئے وہ تمام ہندوستانی زبانوں کے الفاظ ہوں جسے اُردو نے قبول کرلیا ہے اور جس کا چلن بول چال اور لکھنے کی سطح پر ہو رہا ہے۔ اس کام کے لیے ایک مستقل ادارہ اُردو لغت بورڈ کا قیام ہونا چاہیے جس میں روز کام ہو، جیسا کہ دنیا کی بڑی انگریزی ڈکشنری میں ہو رہا ہے۔ اس لغت کی تیاری کے سلسلے میں قومی اُردو کونسل کو آگے آنا چاہیے اور ہندوستان کے مختلف علاقوں سے مختلف زبانوں کے باخبر ماہرین کا ایک ایسا بورڈ بنانا چاہیے جو اس کام کو انجام دے۔ یہ بورڈ اب تک موجود تمام لغات کو سامنے رکھتے ہوئے لغت سازی کے سلسلے میں کچھ رہنما اصول متعین کرے اور پھر ان اصولوں کی روشنی میں لغت کی تیاری باضابطہ طریقے سے ہو۔

ہندوستان جیسے کثیر لسانی ملک میں ایک ایسی لغت کی ضرورت بھی محسوس کی جارہی ہے جو کثیر لسانی ہو۔ یعنی ایک ایسی لغت تو ضرور ہو جس میں اُردو کے ساتھ ساتھ دستور ہند میں ذکر تمام زبانیں بھی ہوں۔ یعنی اُردو کا ایک لفظ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں کیا معنی رکھتا ہے یا ایک لفظ کس طرح معمولی تبدیلی سے ایک زبان سے دوسری زبان کے ہو جاتے ہیں اس کا پتہ ہمیں اس کثیر لسانی لغت سے چل جائے گا۔ اس سے یہ بھی واضح ہوگا کہ اُردو کے کون کون سے الفاظ دوسری زبانوں میں رائج ہیں اور دوسری زبانوں کے کون کون سے الفاظ یہاں رائج ہیں اور یہ کہ ان کے تلفظ اور معنی میں کیا کیا تبدیلیاں آئیں ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ مختلف زبانوں سے اُردو کے روابط کا پتہ بھی چلے گا اور زبان کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا۔

www.taemeernews.com

چھ اور سات زبانوں کی لغت تو ہمارے یہاں عرصۂ قدیم سے موجود ہے۔ آپ میں سے بہت سے حضرات کو شاید یہ علم نہ ہو کہ ہندوستان کی ریاست بھوپال میں رئیسہ ریاست بھوپال شاہجہانی بیگم نے ۱۸۸۶ء میں ''خزانۃ اللغات'' کے نام سے چھ زبانوں کی لغت مرتب کی تھی۔ بڑے سائز کی اس لغت کے آمنے سامنے کے دو صحیفوں کو اُردو، فارسی، عربی، سنسکرت، انگریزی، ترکی کے چھ خانوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور اُردو کو بنیاد بنا کر ہر زبان کی لغت کے لیے خانہ مخصوص کر دیا گیا ہے۔ سنسکرت اور انگریزی کے خانوں اور رسم الخط کے ساتھ لغات کو دیوناگری رسم الخط اور انگریزی رسم الخط میں بھی لکھا گیا ہے۔ دو جلدوں کی اِس لغت کو شاہجہانی بھوپال نے شائع کیا ہے۔ آج سے تقریباً ۱۱۷ سال قبل ایک خاتون کے ذہن میں اس طرح کی لغت کے بنانے کا خیال پیدا ہوا اور اس خاتون نے اس کو عملی جامہ پہنایا۔

میری معلومات کے مطابق ہندوستان میں اب تک اس طرح کی لغت کا کوئی منصوبہ سامنے نہیں آیا ہے۔ نہ ہی صوتی لغت اور لغت تلفظ بنانے کی طرف کسی ادارے کی توجہ ہو سکی۔ اُردو تھیسارس کا معاملہ تو اس کے بعد کا ہے۔ دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے اُردو کی دفتری حیثیت کو مستحکم کرنے کے لیے مختصر نویسی کی لغت کا بننا بھی بے حد ضروری ہے۔ دیکھئے کب اس پر توجہ ہوتی ہے۔

جہاں تک ذولسانی لغت کا تعلق ہے تو ترقی اُردو بورڈ نے اس سلسلے میں اہم قدم اٹھایا تھا اور کلیم الدین احمد کی نگرانی میں ۱۹۷۲ء میں ایک کمیٹی بنائی گئی تھی۔ جس نے ''جامع انگریزی اُردو ڈکشنری'' کے پروجیکٹ پر کافی محنت اور لگن سے کام بھی کیا۔ دس سالوں کی محنت شاقہ کے بعد یہ لغت تیار تو ہوگئی لیکن اُسے چھپنے کے لیے تقریباً بیس سالوں تک انتظار کرنا پڑا ان بیس سالوں میں دنیا بدل گئی اور لسانی منظر نامہ بھی بدلا۔ افادیت سے بھرپور اس کام کی افادیت میں وقت کے ساتھ کافی کمی واقع ہوگئی اور جب چھپنے کا سلسلہ شروع ہوا تو اسے ایک اور انقلاب سے گزرنا پڑا: یعنی ترقی اُردو بورڈ قومی کونسل برائے فروغ اُردو میں تبدیل ہوگیا۔ بیورو کی زندگی میں اس کی صرف پہلی جلد شائع ہو سکی۔ جب کونسل بنی تو کونسل نے اپنے کارناموں کی فہرست گنانے کے لیے تمام تیار شدہ مسودوں کو بغیر کسی نظر ثانی کے عجلت میں شائع کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کلیم الدین احمد کا یہ عظیم کارنامہ جو نظر ثانی کا محتاج تھا بغیر کسی ردوبدل کے شائع کر دیا گیا اور قیمت اتنی رکھی گئی کہ عام آدمی کی قوت خرید سے باہر۔ ترقی اُردو بیورو تک اس ادارے سے شائع ہونے والی کتابوں کی قیمت فروغ اُردو کے منصوبے کے تحت کم سے کم رکھی جاتی تھی لیکن کونسل کا

www.taemeernews.com

رجحان منافع کمانے کی طرف زیادہ ہوگیا۔ اس لغت کی قیمت -/3400 روپے ہے۔ اس سے فروغ اُردو کے منصوبے کو کتنی تقویت حاصل ہوگی غور فرمایئے۔

ذرا ہندوستان میں شائع ہونے والی اصطلاحات پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ ترقی اُردو بیورو نے اپنے قیام کے چند سالوں بعد سے ہی اصطلاحات سازی کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اور بہت سے مضامین کی اصطلاحیں بن کر تیار بھی ہوئیں لیکن بیورو سے کونسل تک کے تقریباً چالیس پینتالیس سالوں کے اس سفر میں اصطلاحات سازی پر جو توجہ دی جانی چاہیے تھی وہ نہیں دی گئی۔ نتیجتاً کچھ مضامین کی اصطلاح سازی تو ہوئی لیکن علوم وفنون کے کئی بڑے اور اہم شعبوں پر توجہ اب تک ہنوز نہیں دی جا سکی ہے۔ انجینئرنگ اور میڈیکل کے مختلف شعبے دوسرے پیشہ وارانہ مضامین، عدالتی، قانونی، دفتری، تعلیم کے مختلف نظاموں اور کاروباری اصطلاحوں کی تیاری کی طرف توجہ نہیں دی جا سکی۔ دوسرے آج سے پندرہ بیس سال قبل تیار اصطلاحوں پر بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ نئے مضامین کی اصطلاحات سازی کی طرف کونسل کی توجہ کوئی خاص نظر نہیں آ رہی ہے۔ جبکہ کونسل کے کاموں میں لغات سازی، اصطلاحات سازی اور اشاریہ سازی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

فروغ اُردو کے تمام تر دعووں کے باوجود زبان کے بنیادی مسائل کی طرف کونسل کی کوئی بھی سنجیدہ کوشش اب تک ہوتی نظر نہیں آ رہی ہے۔ لغت سازی بھی زبان کے بنیادی کاموں میں ایک اہم کام ہے۔ لغت نہ صرف الفاظ کے ذخیرے کو محفوظ کرتی ہے بلکہ زبان کی قوت کو بھی بڑھاتی ہے۔ کسی بھی زبان کی قوت کا اندازہ اس کے ذخیرۂ الفاظ سے لگایا جاتا ہے۔ ذخیرۂ الفاظ کی موجودگی کے بغیر فروغ زبان کا کوئی بھی دعویٰ کھوکھلا ہی ثابت ہوگا۔

●●●

www.taemeernews.com

ڈاکٹر انوار احمد خاں

اُردو زبان کا سیکولر کردار

ہندوستان کو زبانوں کا عجائب گھر کہا گیا ہے۔ گریرسن کے لسانی سروے کے مطابق متحدہ ہندوستان میں ۱۷۹ زبانیں اور ۵۴۴ بولیاں پائی گئی تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں سے بہت سی بولیوں کا دائرہ اتنا محدود رہا ہوگا کہ عام طور پر انہیں لسانیات کی تاریخ میں کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی۔

ہندوستان کی سب سے بڑی دو زبانیں، دو جڑواں بہنیں اُردو اور ہندی ہیں۔ ہندی کو آزاد ہندوستان میں راشٹر بھاشا بننے کا شرف حاصل ہوا اور اُردو تقسیمِ وطن کے بعد پاکستان کی قومی زبان بننے کے ساتھ ساتھ خود بھی دو ملکوں میں بٹ گئی۔

اُردو کو اس کا یہ نام انیسویں صدی کے آغاز سے کچھ ہی پہلے اُس وقت ملا جب یہ زبان اپنے ارتقائی مراحل کی کئی منزلیں طے کر چکی تھی اور ہندی یا ہندوی کے نام سے جانی جاتی تھی۔ واضح رہے کہ ہندی یا ہندوی، بلکہ ہندوستانی بھی، جدید ہندی کے ساتھ اس کا مشترک نام تھا جس کا خمیر کھڑی بولی سے تیار ہوا تھا۔ ہندی کا رجحان دیوناگری رسم الخط کے ساتھ سنسکرت لفظیات کی طرف تھا اور اُردو کا فارسی رسم الخط کے ساتھ عربی، فارسی اور سنسکرت کی طرف۔

کم از کم ۷۰ فیصدی مشترک صفات کے پیشِ نظر، اس خیال کو یکسر مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ یہ دونوں زبانیں، ایک ہی زبان کی دو شیلیاں ہیں۔ یہاں یہ اشارہ کرنا بے محل نہ ہوگا کہ آزادی

www.taemeernews.com

سے قبل، متحدہ ہندوستان میں، ہندی کے مقابلے میں اُردو کا دائرۂ کار کہیں زیادہ وسیع تھا۔ اُردو اس اعتبار سے بھی دوسری زبانوں کے مقابلے انفرادی خصوصیات کی حامل ہے کہ اس کا کوئی خاص اپنا علاقہ نہیں اور اس کی آبیاری کرنے والوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مذاہب اور طبقوں کے لوگ کہیں زیادہ پیش پیش رہے ہیں۔

زبان کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والے واقف ہیں کہ جب کسی قوم یا ملک کو دوسری قوم یا ملک پر فتح حاصل ہوتی ہے تو فاتح، اپنی زبان مفتوح پر نہیں لادتا، بلکہ اپنی زبان کے ضروری الفاظ، مقامی زبان میں ملا کر، اسے اپنے لیے بھی قبول کر لیتا ہے۔ زبانِ اُردو اسی طرح ہندی، ہندوی یا ہندوستانی سے اُردو بنی۔

حصولِ آزادی اور تقسیم ملک کے بھیانک نتائج کے بعد جن قدروں کو Defensive یا مدافعانہ صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا، اُن میں اُردو بھی شامل ہے۔

میرا آج کا موضوع ''اُردو زبان کا سیکولر کردار'' دراصل اُردو کے اس مدافعانہ رویّے اور کس میرسی کی مثال بھی ہے اور دین بھی۔ ورنہ کسی بھی زبان سے جو کسی چھوٹی یا بڑی سماجی اکائی میں رابطے اور اشتراک کا وسیلہ ہوتی ہے اور جسے انفرادی اور اجتماعی حسیت کے اظہار کا فریضہ انجام دینا ہوتا ہے۔ اُس سے ایسے مطالبے کے کیا معنی؟

۲/اپریل کے انگریزی روزنامے ''دی ایشین ایج'' میں معروف اسکالر ڈاکٹر رفیق زکریا کا ایک مضمون چھپا ہے۔ عنون ہے۔

The Ties That Endure

ڈاکٹر زکریا نے اپنے مضمون میں، چند سال قبل اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لیے ایک بڑی رقم کے ساتھ National Foundation for Communal Harmony کے قیام کا ذکر کرتے ہوئے، جس کے ایک ممبر وہ خود بھی تھے لکھا ہے کہ ایک میٹنگ میں جس میں وہ موجود نہیں تھے، چیرپرسن نے دریافت کیا کہ اُردو زبان میں بھگوت گیتا سے متعلق کیا کیا کام ہوا ہے تو ارکان میں سے جس میں کئی مرکزی وزرا اور بڑی شخصیتیں شامل تھیں کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میٹنگ میں فیصلے کے مطابق، ضروری تفصیلات حاصل کرنے کے لیے ملک کے ۳۵ اُردو اخباروں میں اشتہار دیے گئے۔ ڈاکٹر زکریا نے لکھا ہے کہ چونکہ Intellectuals اور اسکالرس، اشتہار نہیں پڑھتے۔ اشتہار تو صرف ملازمت کے متلاشی بے روزگار نوجوان اور تجارت پیشہ لوگ پڑھتے

www.taemeernews.com

ہیں۔ اس لیے کوئی جواب نہیں آیا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر زکریا کو بھی اس کا علم مذکورہ میٹنگ کی رپورٹ سے ہوا۔ بہر حال اگلی میٹنگ میں ڈاکٹر زکریا نے مطلوبہ تفصیلات فراہم کیں۔ ڈاکٹر زکریا نے نظام کی ریاست حیدرآباد کے وزیراعظم مہاراجا کشن پرساد کے نام ۱۱/اکتوبر ۱۹۲۱ء کا لکھا ہوا علامہ اقبال کا خط بھی پڑھ کر سنایا جس میں لکھا تھا:

> ''مجھے افسوس ہے کہ سنسکرت الفاظ کی نغمگی کو اُردو میں منتقل کرنا ناممکن ہے۔ اگر وقت نے اجازت دی تو میں گیتا کا اُردو میں ترجمہ کروں گا۔ آپ نے فیضی کا فارسی ترجمہ دیکھا ہوگا۔ ان کی قابلیت اور قادرالکلامی سے کسی کو انکار نہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ گیتا کا ترجمہ کرتے وقت وہ اُس کے نفس مضمون اور اسلوب کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ فیضی گیتا کی روح کو سمجھنے میں ناکام رہے ہیں''۔

ڈاکٹر زکریا نے مزید لکھا ہے کہ اُردو کے ایسے اہم شاعروں اور ادیبوں کی تعداد بہت ہے جنہوں نے گیتا کے پیغام اور فلسفے کو اُردو نثر و نظم میں فنی مہارت اور گیتا کی عظمت اور تقدس کے شایانِ شان پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر زکریا نے اپنے مضمون میں حسرت موہانی، خواجہ دین محمد، نہال سیوہاروی، کیفی اعظمی اور ساحر لدھیانوی کی تخلیقات کے کچھ نمونوں کا انگریزی ترجمہ بھی پیش کیا ہے۔ اس مضمون میں علی گڑھ کے ڈاکٹر محمد عزیز کی کتاب کا حوالہ بھی ہے جسے انجمن ترقی اُردو ہند نے ۱۹۷۵ء میں چھاپا تھا۔ ۱۹۵۵ء میں پہلی بار چھپنے والی یہ کتاب دراصل ڈاکٹر محمد عزیز کا Ph.D کا مقالہ ہے جس کا عنوان ہے'' اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اُردو کا حصہ''

اس کتاب میں ڈاکٹر محمد عزیز نے ہندو مذہب اور اُس کے اصلاحی فرقوں کبیر پنتھ، برہمو سماج، آریہ سماج، تھیوسوفیکل سوسائٹی، رادھا سوامی مت اور دیو سماج کے علاوہ جین مذہب، سکھ مذہب، عیسائی مذہب اور بہائی مذہب کی تعلیمات کی ترویج و اشاعت میں اُردو زبان کے کردار پر بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے اس زبان کے فروغ میں غیر مسلموں کے رول پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

> '' یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ ہندوستان کی یہ مشترک زبان صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ اس زبان کی تاریخ کا سرسری مطالعہ بھی اس

www.taemeernews.com

نظریے کی تردید کے لیے کافی ہے۔ غیر مسلموں، بالخصوص ہندوؤں نے اس زبان کی تشکیل، ترقی اور اشاعت میں جتنا زیادہ حصہ لیا ہے اس کا بیان ایک مستقل تالیف چاہتا ہے۔ پیش نظر مقالے میں صرف ان کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے جو غیر مسلموں نے اپنے مذہب اور مذہبی اخلاق سے متعلق، اُردو میں لکھ کر شائع کی ہیں۔ ایسی کتابوں کی تعداد کئی سو ہے۔ انڈیا آفس کے Catalogue میں جس میں صرف انیسویں صدی کے آخر تک کی کتابیں درج ہیں ان کی تعداد ۱۳۷ ہے۔

اسی ذیل میں مشہور زمانہ رہنما لالہ لاجپت رائے کی کتاب ''مہاراجا شری کرشن اور ان کی تعلیم''، مطبوعہ ہندوستانی برقی پریس لاہور ۱۹۰۰ء کے دیباچہ کا یہ جملہ نقل کیا گیا ہے۔

'' اُردو حقیقت میں ہندوستانیوں کی زبان کا نام ہے۔ بلکہ اکثر موقعوں پر اُردو اور ہندوستانی ایک ہی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔''

پنڈت جتیشور پرساد مائل دہلوی نے ''حسنِ اول'' کے نام سے ایک دلچسپ کتاب لکھی ہے جس میں جین، بودھ اور ہندو مذہب کے فلسفے، ادب، اخلاق اور علوم وفنون کا گلدستہ بقول ڈاکٹر محمد عزیز نہایت پاکیزہ زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے دیباچے کا یہ اقتباس سنیے:

'' جب سے سرکار انگلشیہ کی حکومت ہم پر ہوئی اور عدالتی دفاتر کی زبان اُردو ٹھہری تو اس کی کچھ قدر ہوئی۔ لوگوں کے شوق اور خیالات نئے نئے پہلو بدلنے لگے۔ رفتہ رفتہ تہذیب پھیلی اور ہماری رفتار و گفتار کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف نے بھی انگریزیت کا جامع پہننا شروع کر دیا۔ چنانچہ تھوڑے عرصے میں وہ نمایاں ترقی کی کہ آج اُردو بچے سے جوان ہوگئی۔ اگرچہ اُردو کا جنم خاص دہلی میں ہوا اور اس نے اسی خطے میں پرورش پائی، مگر تھوڑی مدت میں اتنی بڑھی چڑھی کہ تمام ہندوستان کی زبان یہی ہوگئی بلکہ اُردو سے ہندوستانی کہلانے لگی۔ میں اگرچہ ناشر نہیں ہوں، ناظم نہیں ہوں، انگریزی مجھے بالکل نہیں آتی۔ دنیا کی اور بہت سی زبانوں سے بے بہرہ ہوں۔ علوم وفنون میں بھی کچھ دستگاہ نہیں رکھتا۔ سنسکرت اور فارسی میں بھی اپنے آپ کو کسی قابل نہیں

www.taemeernews.com

سمجھتا۔ ہاں اُردو میری مادری زبان ہے۔ اس کی ترقی اور بہبودی کی کوشش کرنا، ایک سعادت مند اولاد کی طرح میرا فرض ہے، لہٰذا بایں ہمچدانی ہمت کرتا ہوں کہ پرانے رشیوں اور مہاتماؤں کے باغ سے عمدہ عمدہ پھول چن کر لاؤں اور ان سے اُردو کے ایوان سجاؤں۔ اب اس میں برکت دینا اور میری محنت کو ٹھکانے لگانا اُسی کا کام ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔''

ڈاکٹر محمد عزیز کی کتاب سے اس طرح کے اقتباسات اور مثالیں بے شمار پیش کی جاسکتی ہیں۔ صرف ایک مثال اور پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ پنڈت منوہر لال زتشی نے اپنی کتاب ''کبیر صاحب'' میں ہندو مذہب کے اصول بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

''ہندو مذہب کا ایک اور نمایاں اصول رواداری اور ٹولریشن ہے۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ راستے مختلف ہیں مگر منزل ایک ہے۔ انسانوں کے مختلف گروہ، مختلف طریقوں کو استعمال کرتے ہیں۔ مگر غرض وغایت سب کی ایک ہے۔ عیسیٰ بدینِ خود، موسیٰ بدینِ خود۔ خدا خالقِ کائنات ہے اس کا لطف وکرم اپنے سب بندوں پر ہونا چاہیے۔ آفتاب کی حرارت، چاندنی کی ٹھنڈک، موسموں کا تغیر کسی خاص گروہ کے لیے مخصوص نہیں۔ ہاں! یہ ہوسکتا ہے کہ کسی باغ کی آرائش گلاب اور چنبیلی سے ہو اور کسی کی گل داؤدی اور گلِ نیلوفر سے، کہیں انگور اور انار پیدا ہوں اور کہیں آم اور انجیر۔ لیکن یہ بات ہندوؤں کی سمجھ میں نہیں آئی کہ خلاقِ عالم، کسی ایک قوم کو ایک خاص مذہب کی تلقین کرے اور باقی اقوام کو کفر وجہالت میں مبتلا رکھے۔ اور پھر ان کے واسطے کفر وجہالت کی سزا مقرر کرے۔ گیتا میں لکھا ہے جو لوگ جس طرح میرے پاس آتے ہیں میں اسی طرح اُن سے ملتا ہوں۔ اے ارجن! منش لوگ ہر طرح میرے راستے پر آتے ہیں۔''

اب آیئے ذرا اُردو زبان کے ارتقا پر سرسری نظر ڈالتے ہیں۔ پروفیسر سید احتشام حسین نے اُردو زبان اور ادب کی ابتدا کے ضمن میں لکھا ہے کہ:

www.taemeernews.com

''امیر خسرو نے جس زبان کو ہندوی کہا ہے، سچ یہ ہے کہ ہم اُس سے ہندی زبان کی تاریخ بھی شروع کر سکتے ہیں... زبان سماجی زندگی کی بنیاد پر بنتی ہے۔ اُس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ مختلف زبانیں بولنے والے جب ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں تو لفظوں کا لین دین ضروری ہو جاتا ہے۔ جس طرح پرتھوی راج راسو میں چندر بردائی نے عربی فارسی لفظوں کا استعمال کیا ہے، اسی طرح فارسی شعرا نے بھی یہاں کے لفظ لیے۔ چندر بردائی نے جو لفظ لیے ہیں اگر ان پر غور کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ وہ زیادہ تر وہی لفظ ہیں جن کی کچھ سماجی اہمیت تھی اور جن کو ربط ضبط کے باعث عام لوگ بھی سمجھنے لگے تھے۔''

پروفیسر سید احتشام حسین نے مزید لکھا ہے کہ:

''اگر ہم اس زبان کے اس تیزی سے بڑھنے پر غور کریں تو اس کا ایک بڑا اور نمایاں سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ دلّی کی فوجوں میں ہر جگہ کے لوگ ہوتے تھے جن میں ہندو بھی ہوتے تھے اور مسلمان بھی۔ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے رہتے تھے۔ ان میں سے بیشتر سرکاری زبان سے، جو فارسی تھی، ناواقف تھے اور سنسکرت سے بھی جو یہاں کی خاص علمی زبان تھی نابلد تھے، اس لیے ان کے ربطِ باہم کا وسیلہ، بول چال کی کوئی ایسی ہی زبان ہو سکتی تھی، جس میں ضرورت کے مطابق، فارسی، عربی اور سنسکرت الفاظ کا استعمال بھی ہوتا ہو، لیکن جس کی بنیاد مرکزی علاقے والی بول چال کی زبان ہو۔ یہ زبان دلّی کے دارالسلطنت ہونے کے سبب سے کھڑی بولی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس پر پنجابی، ہریانی اور برج کا اثر پڑنا بھی لازمی تھا۔''

اس زبان کو اپنے تشکیلی دور میں ہی علاء الدین خلجی کی فوجوں کے ساتھ دکن میں قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ یہاں واضح رہے کہ جنوبی ہند دراوڑ زبانوں کا علاقہ ہے۔ ترین سُر پن علاقہ صرف مہاراشٹر تھا جہاں آریائی زبان مراٹھی بولی جاتی تھی۔ اس ضمن میں محمد تغلق کا کارنامہ بھی کم اہمیت کا حامل نہیں جب اس نے چودھویں صدی میں دہلی سے مہاراشٹر کے مقام دیوگری

www.taemeernews.com

پر اپنا دارالسلطنت منتقل کیا اور دولت آباد نام رکھا۔

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے لے کر میراجی شمس العشاق، نصرتی، باشمی، قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی، ابن نشاطی، ولی اور سراج کے عہد تک کے ادب کا جائزہ لینے سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ بقول سید احتشام حسین:

> ''دکن میں جس ادب کا فروغ ہو رہا تھا اُس میں جس تہذیب کا رنگ جھلکتا تھا اُس پر ہندوستانیت کی گہری چھاپ تھی۔ وہاں کے شعرا کی تخلیقات مقامی رنگ سے مالا مال ہیں۔''

اب آیئے واپس آتے ہیں شمالی ہند کی طرف، اٹھارہویں صدی کی دلّی، مغل سلطنت کے زوال، نادر شاہ کے حملے اور اُردو شاعری کا قدم دلّی میں جمنے سے عبارت ہے۔ بقول سید احتشام حسین:

> ''اگر مغل سلطنت طاقتور ہوتی تو نہ نادر شاہ دلّی کو لوٹتا اور نہ فارسی کو دبا کر عوام کی زبان، اہم زبان کی شکل اختیار کرتی۔ فائز، آبرو، ناجی، حاتم، یک رنگ، مظہر جانِ جاناں، مضمون، فغاں، تاباں، اور بہت سے دوسرے شاعر اس عہد میں شمار کیے جاتے ہیں۔...ان کی زبان آسان ہندوستانی تھی۔''

فائز کی شاعری میں مقامی رنگ گہرا ہے۔ وہ ہندو دھرم کے خاص تیوہاروں اور بزرگوں کا ذکر بھی بڑے دلکش انداز میں کرتے ہیں۔ ان کی تشبیہات میں بھی ہندی شاعری کا رنگ جھلکتا ہے۔ اُس وقت کے میلوں اور تیوہاروں کا بیان ان کے یہاں بڑے عمدہ طریقے سے آیا ہے۔ دلّی کے ایک گھاٹ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہے اِندر کی مانو سبھا جلوہ گر
کہ ہر نار دِستی ہے رمبھا سے وَر
لے جاتی ہے جیوں اپسرا جی کو چھل
کہ دیکھ اون کو پانی میں دل جائے جل
ہر اک نار سورج سی شوبھا دھرے
کھڑی ہو سُرج کی پُسپا کرے

ایک غزل کے کچھ شعر دیکھیے:

www.taemeernews.com

گلی تیری مجھ دل کو پیاری لگے
دعا میری تجھ من میں بھاری لگے
نہیں تجھ سا اور شوخ اے مَن ہَرن
تری بات دل کو نیاری لگے

یہاں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مرزا محمد رفیع سوداؔ کا دور آتے آتے دیسی الفاظ، محاورات اور تراکیب کا زور کم ہونے لگتا ہے اور فارسی کا اثر بڑھنے لگتا ہے۔ غالباً اس کی وجہ قصیدہ کا فروغ ہے۔ اس پورے دور میں کوئی ایسا نمونہ ڈھونڈنا دشوار ہی نہیں ناممکن سا ہے جسے تنگ نظری اور تعصب پر مبنی یا غیر سیکولر کہا جا سکے۔ میرؔ کا یہ شعر سنئے ۔

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو ہو! یہ بستی اجاڑ کے

اور یہ بھی کہ ۔

نہ مل میرؔ، اب کے امیروں سے تو
ہوئے ہیں فقیر اُن کی دولت سے ہم

اس دور کے شعرا کے سلسلے میں سید احتشام حسین کی یہ رائے یاد رکھنے کے قابل ہے:

''یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ شعرا ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے اور یہی سبب ہے کہ وہ اپنی شاعری میں ملک کے داخلی و خارجی مسائل سے دور نہیں رہتے تھے۔ ہولی، دیوالی، پنگھٹ، اشنان، مالن، جوگن وغیرہ پر اُن کی نظمیں ملتی ہیں۔ سماجی، اقتصادی اور سیاسی پس منظر ملتا ہے۔ مگر وہ سماجی شعور نہیں ہے جو انہیں بہتر راستہ دکھا سکتا۔ وہ کوئی منکرِ خدا نہیں تھے مگر ان کی آزادیٔ خیال ان کو تنگ نظری اور فرقہ پرستی کے قریب بھی نہیں آنے دیتی تھی۔ ان کا مذہب کا مفہوم تھا باطنی پاکیزگی اور انسانی محبت جو تصوف اور اخلاق کے مطالعے سے انہیں ہاتھ لگا تھا۔''

اودھ کی دنیائے شاعری گنگا جمنی تہذیب اور لطافت کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

www.taemeernews.com

نہ چھیڑ اے نکہتِ باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بے زار بیٹھے ہیں

اور آتش کا یہ شعر ۔

بت خانہ کھود ڈالیے مسجد کو ڈھایئے
دل کو نہ توڑیے کہ خدا کا مقام ہے

انیسؔ اور دبیرؔ نے تو واقعۂ کربلا کو خالص ہندوستانی رنگ میں اس طرح ڈھال دیا ہے جیسے کربلا، عراق وعرب میں نہیں بلکہ کروکشیتر یا ہندوستان کا ایسا ہی کوئی دوسرا مقام ہو۔
نظیر اکبرآبادی تو قنوج کے عطرِ گل کی طرح آگرے کا خمیر بھی ہیں اور ضمیر بھی ۔

عاشق کہو، اسیر کہو، آگرے کا ہے
مُلّا کہو، دبیر کہو آگرے کا ہے
مفلس کہو، فقیر کہو آگرے کا ہے
شاعر کہو، نظیر کہو، آگرے کا ہے

اور آدمی نامہ کا صرف ایک بند ۔

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں — بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نماز، یاں — اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

عہد غالب اور بالخصوص غالب کی شاعری، آپ بیتی سے لے کر جگ بیتی تک اور اپنے وقت کی آواز سے لے کر ابدی حقائق کی شاعری ہے۔

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

فورٹ ولیم کالج کے قیام کا جو بھی مقصد رہا ہو لیکن اُردو ہندی کے فروغ میں اس کی خدمات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہیں سے اُردو ہندی کے اختلاف نے سیاسی شکل اختیار کرلی۔ انگریزوں کی لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی نے پہلی جنگِ آزادی یعنی ۱۸۵۷ء تک اس خلیج کو اور بھی بڑھانے میں کامیابی حاصل کرلی۔ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کی ۹۰ رسالہ جدوجہدِ آزادی میں ویسے تو ہندی اور اُردو دونوں کی خدمات غیر معمولی ہیں

www.taemeernews.com

لیکن بلا تکلف یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ہر لحاظ سے اُردو کی خدمات کا پلڑا بھاری ہے۔

دو عالمی جنگوں کے درمیان جب آزاد ہندوستان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا محسوس ہونے لگا تو سرفروشانِ وطن کی اچھی تعداد کے لیے ہندوستان، جاں نثاری کی حقدار مادرِ وطن کے بجائے جنگ میں جیتا جانے والا مالِ غنیمت نظر آنے لگا۔ نتیجہ دو قومی نظریہ، قومی زبان کا مسئلہ بھی درپیش آیا۔ خیر چھوڑیئے۔ بات نکلے گی تو پھر دور تلک جائے گی۔

علامہ اقبال کی ایک مشہور چھوٹی سی نظم ہے۔ ''نیا شوالہ'' بیسویں صدی کے اوائل میں کہی گئی ہے۔ اخیر میں اس کا ایک بند سن لیجئے اور مجھے اجازت دیجئے۔

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقشِ دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

●●●

www.taemeernews.com

ڈاکٹر مولا بخش

عوامی اظہار؟ ادبی اظہار: مماثلت وافتراق

ہندوستان، یعنی زبانوں کے دیس میں پلی بڑھی اُردو نے جدید ہندوستان کی تعمیر میں تاریخ کے ہر اہم موڑ پر وقت اور حالات کے اعتبار سے ادبی پیرایوں کے راستوں کا انتخاب کیا ہے مگر وہ انداز واسلوب، وہ فطری اظہار جسے مرصع اسلوب کے برعکس عوامی اظہار یا سادگی میں پُرکاری والا اظہار کہا جاتا ہے، ہر دور میں زبان وادب کو ہر دلعزیز بنایا نیز اس زبان کے فروغ میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔

میرے مقالے کا موضوع عوامی اظہار؟ ادبی اظہار مماثلت وافتراق ہے، یعنی اِس مقالے میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ کیسے ادبی زبان عوامی اظہار یعنی عوام کی بولی ٹھولی کو اپنا کر ایک ایسا فن پارہ تخلیق کرتی ہے جسے بیک وقت قارئین کے ہر حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور وہ ادبی فن پارہ جس میں توارد، نقل اور عوامی زبان سے انحراف کا گراف حد درجہ بڑھا ہوا ہوتا ہے اس کا حشر کیا ہوتا ہے، اور زبان وادب کے فروغ میں اس کا رول مثبت کم منفی زیادہ کس طرح ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ اس بات کی طرف اشارہ کرنا بھی اس مقالے کا مقصد ہوگا کہ وہ کون سا اظہار ہے جس کی ضرورت آج کی ادبی تخلیق کو درپیش ہے اور جو زبان وادب کے فروغ میں حد درجہ معاون ہوگا۔ عوامی اظہار میں بھی ہر عہد میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اس لیے یہ پتہ لگانا بھی از حد ضروری ہے کہ وہ کونسا پیرایۂ اظہار ہے جو جنم لے چکا ہے اور اُردو کا عوامی اسلوب فی

www.taemeernews.com

زمانہ کیا ہے؟

ایسے میں اس بات پر غور کرنا بہت ضروری ہے کہ ادبی اسلوب کا وہ کون سا ایسا وصف تھا جو ہر دور میں قابل قبول رہا جس نے زبان کے فروغ میں حد درجہ معاونت کی تھی۔ جب اُردو زبان و ادب کے ابتدائی ایام کے ادبا و شعرا کے متون کی قرأت کرتے ہیں تو چند نکات ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ اوّل یہ کہ اُردو جب اس قابل ہوئی کہ اس میں ادب تخلیق کیا جا سکے تو یہ صرف اور صرف عوام کی زبان تھی اور اس سے ذرا آگے بڑھیے تو ان صوفیوں سنتوں کی زبان تھی جن کا مقصد کسی مذہب کی تعلیم یعنی انسانیت کی تعلیم تھا۔ آہستہ آہستہ اُردو ترقی کرتی رہی جس کے سر پر فارسی کی پگڑی باندھ دی گئی۔ زمانوں تک فارسی سرکاری زبان تھی جس کے زیر سایہ اُردو پروان چڑھتی رہی۔ اُردو کے ابتدائی ادیب و شاعر فارسی زبان کے بولنے والے ہی نسبتاً زیادہ تھے اور انہیں میں کچھ وہ لوگ بھی تھے جو اسی مٹی کے تھے جنہوں نے مقامی الفاظ پر مبنی کھڑی بولی میں ادب تخلیق کی جن پر عربی و فارسی کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ پہلی صف میں گرونانک، امیر خسرو، سلمان سعد، قلی قطب شاہ اور دوسری صف میں کبیر جیسے شعرا جنہوں نے عربی و فارسی کے الفاظ کا استعمال اپنے مخرج کے اعتبار سے کیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے ادب و شعر کا اسلوبی تصور کیا تھا؟ دو باتیں اس سلسلے میں بلا جھجھک کہی جا سکتی ہیں۔ پہلی یہ کہ انہوں نے اُردو میں مقامی لب و لہجے کو کثرت سے برتا اور اپنے قاری سے ذہنی اور جذباتی رشتہ ہمیشہ برقرار رکھا اس لیے ان کی زبان ایک ایسی ادبی زبان کے روپ میں ابھری جس کا لب و لہجہ عوامی یعنی Pro-people تھا۔ نتیجتاً اُردو، ولی کی آمدِ دہلی تک ہندوستان کی (Link language) یعنی رابطے کی زبان بن گئی۔ جس پر آہستہ آہستہ فارسی زبان کی ساخت و اسلوب نیز اصناف کے گہرے بادل چھا گئے اور اُردو فارسی کی ایک شاخ سی بنتی نظر آنے لگی۔ عوام کی یہ زبان خواص کی زبان بن کر عوامی لب و لہجے سے کٹ سی گئی۔ ''نوطرز مرصع'' اور ''فسانۂ عجائب'' کے عہد تک تو کم از کم یہ صورت برقرار رہی تھی جس کی مثالیں غالب کے بیشتر کلام میں بھی مل جائیں گی لیکن اس طویل سفر میں کچھ ایسے شعرا بھی نظر آتے ہیں جنہوں نے صوفیوں، سنتوں کی روایت اور زبان کو سینے سے لگائے رکھا اور ادب و شعر کی تخلیق میں عام بول چال اور عوامی لب و لہجے کا حد درجہ خیال رکھا۔ اس کی وضاحت آگے کی جائے گی۔

اُردو زبان کی تاریخ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ اُردو کو ہمیشہ تاریخ سازی کے عمل سے گزرنا پڑا

www.taemeernews.com

ہے۔ اُردو کے سامنے ہر عہد میں زبانوں، نسلوں، جنسی شناخت، ہجرت اور تہذیبی و ثقافتی لین دین اتار چڑھاؤ کے مسائل رہے ہیں جس کے اثرات اس زبان کے ادب و اسلوب پر مرتب ہوتے رہے ہیں۔ اُردو بولنے والے لوگ عام طور پر بھی اور خاص طور پر بھی کملا داس کے اس قول کے مصداق رہے ہیں مثلاً:

I am Indian, very brown, born in malabar.

I speak three languages, write in two dream in one.

فارسی کے گہرے بادل اس وقت چھٹنے شروع ہوئے جب اُردو والوں کا سابقہ انگریزوں سے پڑا۔ کلونیلزم جس کا مقصد ہندوستانی تہذیب کی نفی تھی اُردو نے انگریزی ادب کا اثر اس کے باوجود بھی قبول کیا۔ اس نئے ماحول میں اُردو میں اسلوب کی سطح پر خاطر خواہ تبدیلی آئی۔ یہاں میری مراد اُردو میں سادگی تحریک اور عوامی لب و لہجے کی بحالی کے ایک نئے دور سے ہے۔

آیئے اب عوامی اظہار سے متعلق اپنے خیالات کی وضاحت کردوں تا کہ مذکورہ بالا حوالوں سے اُردو میں اسلوب کی سطح پر پیدا ہونے والے رجحانات کا اندازہ کیا جا سکے۔

عوامی اظہار سے مراد اُردو پن ہے جس میں ضروری حد تک فارسی آمیزی اور معرب اسلوب سے گریز ہو۔ یعنی جس اظہار میں زیادہ سے زیادہ پراکرت، دیسی، علاقائی اسماء و افعال پر خصوصی توجہ دی گئی ہو۔ جیسے کبیر، قلی قطب شاہ، امیر خسرو، میر، نظیر، انشاء، ظفر، ذوق، سرسید، حالی، عبدالحق، پریم چند، خواجہ حسن نظامی وغیرہ کے متون۔ ان متون میں جو اسلوب ہے اس کی تشکیل کے لیے ہندوستانی روایات اشیاء اور مقام سے استعارے اور تشبیہیں منتخب کیے گئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اُردو ایک مخلوط زبان ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ متن میں سب سے زیادہ فارسی و عربی سے متاثر ہونے کا ثبوت پیش کیا جائے۔ اُردو بہر صورت پراکرت کی دین ہے جس کی جڑیں ہندوستان کی قدیم زبانوں مثلاً سنسکرت، پالی وغیرہ میں پیوست ہیں۔ عوامی اظہار وہ اسلوب ہے جسے ہم بھاکا کہتے ہیں۔ معرب اور مفرس اسلوب کو بہانہ بنا کر اُردو مخالف تحریکیں چلانے کا اچھا خاصہ موقع بھی اُردو مخالفین کو ہاتھ آتا رہا ہے۔ انگریزوں نے جب 1837ء میں علاقائی زبانوں کو فارسی کی جگہ عدالتی زبان کی حیثیت دے دی جس میں اُردو بھی شامل تھی اور اُردو نے بہار، مرکزی صوبے، شمالی مغربی صوبے اور اودھ میں فارسی کی جگہ لے لی تو اُردو کی مخالفت یہ کہہ کر شروع کی گئی تھی کہ موجودہ اُردو فارسی آمیز، یعنی مفرس ہے اس کی جگہ آسان

www.taemeernews.com

زبان دیوناگری لپی کا چلن عام کیا جائے اور جیسا کہ حکومتِ وقت نے بھی آسان زبان استعمال کرنے کی ہدایت جاری کردی تھی۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ عوامی اظہار یا سادہ و سلیس انداز اُردو کے مخالفین کو بھی پسند ہے اور ثقیل، مشکل دقیق اُردو، فارسی و عربی آمیز اُردو اُردو کے لیے کل بھی اور آج بھی کئی طرح کے مسئلے پیدا کرسکتی ہے۔ کیونکہ اُردو ہمیشہ عوامی احساسات کی ترجمانی کرتی رہی ہے۔ اردو ملک کی واحد زبان ہے جو مشترکہ تہذیب کی نمائندگی کرنے والی زبان کہی جاتی ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح تاج محل اور کبیر۔ تاج محل اور کبیر کو اسی اُردو یعنی رابطے کی زبان یعنی مشترکہ زبان نے پیدا کیا تھا اس طرح گرونانک، امیر خسرو، میر، نظیر نے اسی اسلوبی راستے کا انتخاب کیا تھا جسے عوامی اظہار کا راستہ کہا جاتا ہے۔ یہ زبان وہ زبان تھی جس پر تمدن کی زبان محض ہونے کا الزام نہیں لگایا جاسکتا تھا جیسا کہ بعد کے ادوار میں اُردو کی بدلتی ہوئی اسلوبی مشکلوں کو دیکھ کر اسے تمدن کی زبان بھی کہا گیا۔ آج اُردو کے اس عوامی کردار پر سختی سے عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے۔

زبان کی بنیاد پر ریاستوں کی تقسیم سے اُردو کو نقصان پہنچا یہ بات درست ہے مگر یہ بات بھی درست ہے کہ اُردو لسانی ریاستوں کے سوالوں سے پرے ہے۔

ایسے میں ریاستی و علاقائی زبانوں سے اُردو کے رشتے مزید نئے ڈھنگ سے استوار کرنے کی ضرورت ہے تاکہ کسی مخصوص ریاست کی مخصوص زبان اور مقامی کلچر کے عناصر اُردو میں درآئیں اور اس کے عوامی اظہار کے دائرے اور وسیع ہوں صرف عربی و فارسی سے چپکے رہنا اچھی بات نہیں۔

عوامی اظہار وہ اظہار و بیان ہے جو ہمیں لوک ادب، جوگیوں، سنتوں صوفیوں کے بھجن اور گیت میں دکھائی دیتا ہے اور جو شخصی اسلوب نہیں ثقافتی اسلوب ہے یعنی قاری اور فنکار کی گفتگو سے تیار ہونے والا اسلوب جس کا انحصار زیادہ سے زیادہ بولی جانے والی زبان پر ہوتا ہے اور جو ہمیں عوامی قصوں، مثل، پہیلیوں، قوالی، خیال، کجری، بھنڈیتی نوٹنکی اور مشاعروں میں دیکھنے سننے کو ملتا ہے۔ غور کیجئے اُردو میں جتنی لسانی تحریکیں چلیں ان میں کچھ ہی تحریکوں میں فارسی زدگی کی وکالت کی گئی تھی ورنہ جملہ تحریکوں کا مقصد عوامی لب و لہجے، قریب الفہم اور کثیر الاستعمال الفاظ کے استعمال پر زور دینا تھا۔ شاہ حاتم نے ایہام کے خلاف سب سے پہلے آواز اٹھائی تھی جو ان کے نزدیک غیر فطری طرز سخن تھی۔ ان کا جھکاؤ لفظی گورکھ دھندے کے مقابلے میں صاف

www.taemeernews.com

گوئی اور سادہ گوئی کی طرف تھا۔ ہومر کے کلام میں لوک ادب کے اسالیب بہت زیادہ دکھائی دیتے ہیں جسے غلطی سے ناقدین نے الحاقی کلام کہا ہے یعنی اس کے کلام میں Anonymous Literature یعنی عوامی ادب کا عنصر زیادہ ہے۔ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہومر سے انگریزی زبان وادب کو کتنی ترقی ملی۔

عوامی اظہار یا عام بول چال کی زبان کا جب بھی مصنفین نے ادبی استعمال کیا ہے عظیم فن پارے وجود میں آئے ہیں۔ جیسے کبیر کی زبان، امیر خسرو، قلی قطب شاہ، نظیر، میر اور غالب کے وہ اشعار جو خالص اُردو پن اور پرانی دلی میں مستعمل بول چال کی زبان پر مبنی ہیں حالی کا مدوجزر اسلام وغیرہ وغیرہ۔

عام بول چال کی زبان یا عوامی اظہار بقول دانتے وہ ہے جس کو بچے اپنے چاروں طرف سے سن کر اسی وقت عادی ہو جاتے ہیں جب وہ پہلے پہل الفاظ میں تمیز کرنا سیکھتے ہیں۔ اسے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہ زبان ہے جسے ہم سن کر سیکھتے ہیں۔ اس زبان کی مثال سفید رنگ سے دی جاسکتی ہے یعنی جس طرح رنگوں میں سارے رنگ سفید سے ناپے جاتے ہیں اور اس رنگ سے دوری یا قربت کی بنا پر رنگوں کو کم یا زیادہ روشن کہا جاتا ہے اُسی طرح ادبی اظہار میں عوامی اظہار وہ سفید رنگ ہے جس سے دوری ادبی اظہار کو پیچیدہ، ادق اور غیر فطری بنا دیتی ہے اور قربت اسلوب کو زیادہ شوخ، چنچل اور مزیدار بنا دیتی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ عوامی اظہار کسی بھی ادبی اظہار کے کواڑوں کا قبضہ ہے وہ شاعر جو درباروں سے وابستہ ضرور تھے جان بوجھ کر ثقافت میں موجود زبان سے انحراف کرتے تھے یعنی عوامی زبان کو منہ نہیں لگاتے تھے اس طرح ان کا اسلوب غیر فطری اور مصنوعی اسلوب ہو جاتا تھا۔ عوامی اظہار فرمائشی ادب تخلیق نہیں کرتا وہ ادب تخلیق کرتا ہے جو ملکوں سرحدوں کو پھلانگ کر ساری دنیا کا سرمایہ بن جاتا ہے۔ کالیداس، ہومر، اقبال، دانتے، غالب، میر، نظیر، کبیر داس کی مثالیں ہیں اور ایسے ہی شعرا و ادبا سے صحیح معنوں میں کسی زبان کو خاطر خواہ فروغ ملتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی باور کرانا ضروری ہے کہ عوامی اظہار کا تناسب کسی فن پارے میں صنفِ سخن کی مانگ پر منحصر کرسکتا ہے مرثیے کی تخلیق میں انیس کا انداز عوامی اظہار، بول چال کی زبان سے بہت قریب ہے یہ اس صنف کی مانگ ہے۔ تنقیدی مضامین لکھتے وقت عام بول چال کی زبان کا ایک منتخب حصہ ہوگا لیکن بیشتر تخلیقات میں عام بول چال کی زبان کا استعمال ناگزیر ہے۔

www.taemeernews.com

آپ نے غور کیا ہوگا کہ بہت سے ایسے فلمی نغمے ہیں جسے فلم کے لیے نہیں لکھا گیا تھا تاہم فلم والوں نے اُسے اپنی فلموں میں شامل کرلیا صرف اسے لیے نہیں کہ وہ نظمیں یا غزلیں آسان تھیں یا نثر کی طرح تھیں بلکہ اس لیے کہ اس میں آسان، سادہ، عام فہم اور بول چال کی زبان میں اہم بات کہی گئی تھی بلکہ لفظیات اور اسلوب عوامی تھا۔ اور سب سے بڑھ کر بات یہ کہ فلم جس کا تقاضہ Pro-people language ہے، ان متون میں موجود تھی۔ جیسے میر کی مشہور غزل'' دکھائی دیے یوں کہ بے خود کیا'' مخدوم کا غزل نما گیت'' پھر چھڑی رات بات پھولوں کی'' غالب کی مشہور غزل'' دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے'' ساحر کی نظم چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں اور شہریار کی غزل'' سینے میں جلن آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے'' وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ فلمی مکالموں میں اکثر اُردو کے اشعار بھی اداکار حسب موقع بولتے نظر آتے ہیں یہ اشعار بھی وہ ہوتے ہیں جس میں سادگی اور پرجستگی ہوتی ہے اور کوئی دل لگتی بات کہی گئی ہوتی ہے۔ کہہ سکتے ہیں ایسے اشعار اور گانوں سے فلم کی مقبولیت میں اضافہ ہوا اور دوسری طرف اُردو کے شاعر و ادیب اور ان کے اشعار گلی گلی میں مشہور ہوگئے جس سے اُردو زبان کی مقبولیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا اور اس زبان کی طرف نئی نسل کی توجہ منعطف ہوئی۔ ورنہ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ جب شاعر دربار سے وابستہ ہوکر چین کی بنسی بجاتے تھے۔ آج کی سوسائٹی میں تو شاعر کو اچھی نگاہ سے بھی نہیں دیکھا جاتا ایسے میں اگر شاعر اپنے اسلوب میں تبدیلی نہ پیدا کرے تو لوگوں کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ شاعر کے تخئیل کی سطح تک اور زبان کے پُر پیچ اظہار کی تہہ تک پہنچنے کی کسرت کریں اور اپنے علمی استعداد کو بڑھائیں۔ یعنی آج جو شاعر دقیق رنگین اسلوب میں بات کرے گا اس سے اُردو زبان کو کتنا فائدہ پہنچے گا اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ غالب کا پورا شعر چھوڑیئے یہ مصرع'' شمار سبحہ مرغوب بتِ مشکل پسند آیا'' آج کے اسکالروں کے بھی پلّے پڑتا نظر آتا ہے؟۔ غالب کے انہیں اشعار کی وجہ سے اُردو کی ترقی ہوئی ہے جس میں اخیر میں آیا کی جگہ آمد لگا دیجئے تو شعر فارسی کا ہوجائے گا۔ یعنی عوامی اظہار میں ایک ایسی سادگی ہوتی ہے جسے Clarity کہا جاسکتا ہے۔ ادب میں سادگی عوامی اظہار کی دین ہے مگر یہ سادگی اپلی کھچڑی نہیں ہوتی بلکہ یہ سادگی شگفتگی اور نیا پن لیے ہوئے ہوتی ہے۔ ایسی زبان لکھنا جو سادگی کے ساتھ ساتھ لطف بیان کے وصف سے مزین ہو صرف باکمال ادیبوں کا حصہ ہے۔ سادگی میں پرکاری کا مطلب یہی ہے۔ سادگی میں قطعیت نہیں ہوتی البتہ معقولیت، شفافیت اور خالصیت ضرور

www.taemeernews.com

ہوتی ہے۔ سادگی کا تعلق خیال سے ہے۔ خیال جتنا واضح ہوگا اسلوب اتنا ہی صاف، سادہ اور رواں ہوگا۔ یعنی سادگی کا تعلق ادیب کے مشاہدے اور گہری وسیع معلومات اور ثقافت میں موجود بول چال کی زبان پر قدرت سے ہے۔ یعنی سادگی ادبی اظہار کی اس اساسی صفات کا نام ہے جس میں اختصار کا حسن بھی مضمر ہوتا ہے۔

زبان میں قتنی ترسیل کا وہ راستہ جو آسان مگر بلیغ ہوتا ہے اس پر کاربند ہونے نہ ہونے میں زبان داں اور قواعد نویس کا رول بھی اہم ہوتا ہے۔ حیرت ہے کہ میر، درد، ضاحک، نظیر، مصحفی، رنگین، جرات، آتش، ناسخ، مومن، ذوق ان عظیم شعرا نے بڑے بڑے ادبی معرکے سر کیے لیکن اظہار و اسلوب کی قواعد ان کے زیر بحث کبھی نہ آئے اور تو اور انہیں اُردو نثر کی بھی کوئی فکر نہ تھی لیکن آج اُردو بولتے وقت ہم ان کی تقلید کو ضروری اور غیر ضروری حد تک ضروری سمجھتے ہیں اور یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ اُردو جہاں پیدا ہوئی اس مقام سے کھسک چکی ہے اور عالمی برادری کا سرمایہ بن چکی ہے جس میں نئے لہجے اور نئے نئے اسلوبی راستے پیدا ہو رہے ہیں۔ اُردو کا مرکز ثقل بدل چکا ہے۔ اُردو میں حفظ مراتب کے وہ اصول جو راجاؤں، بادشاہوں، نوابوں اور امرا کے دربار کی تشکیل کردہ ہیں ان میں سے بعض ایسے ہیں جو متروک ہو چکے ہیں بعض ایسے ہیں جسے ہم ڈھوئے جا رہے ہیں جیسے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ میرا باپ آ رہا ہے بلکہ آج بھی ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ میرے والد بزرگوار یا میرے والد آ رہے ہیں لیکن بعض حفظ مراتب مثلاً فرشی سلام آداب کے لیے ضرورت سے زیادہ جھک جانا وغیرہ نئی نسل اسے خود بھی اپنانا نہیں چاہ رہی ہے، نئے آداب والقاب آ رہے ہیں جو اظہار و اسلوب کے نئے راستے بنائیں گے۔ اب اُردو پر صرف دہلی اور لکھنؤ اسکول کے تمام تر زبان اور کلچر کے مراتب کو لادنا ٹھیک نہیں۔ ان دونوں اسکولوں نے زبان اور کلچر کا جو بھی فارم دیا اس کے کردار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا لیکن اُردو کا پورا Structure یہی دونوں ہیں یہ قابل قبول نہیں ہوگا یہ عوامی کے بجائے خصوصی اسلوب، تکثیریت کے بجائے مرکزیت پسند اسلوب کو راہ دے گا اور اُردو کے فروغ کے راستے محدود ہو جائیں گے۔ البتہ اردو کا وہ کلچر جسے ہم مشاعروں، سمیناروں میں سنتے ہیں لقمے کا کلچر، ٹوکنے اور سوال کرنے کا کلچر ہے وہ ایک جمہوری کلچر ہے اس سے اُردو کے عوامی کردار و اسلوب کو خاطر خواہ فائدہ پہنچا ہے۔

اُردو کو ادق اور مشکل زبان بنانے میں ہمارے ان قواعد نویسوں کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے جو

www.taemeernews.com

لسانیات کے الف اور ب سے واقف نہ تھے۔ یہ وہ قواعد نویس تھے جنھیں لسانیات آج ہدایتی قواعد نویس کے نام سے جانتی ہے۔ صحیح اور غلط زبان سے متعلق مولوی کی طرح فتویٰ دینا ان کا کام تھا۔ ایسے لوگ آج بھی ہیں مثلاً محی الدین شایاں کا مضمون ''مسئلہ اُردو تلفظ اور لب و لہجے کا اکتوبر ۲۰۰۳''، ''آج کل'' میں شائع ہوا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ اُردو کا فروغ اس لیے نہیں ہو رہا ہے کیونکہ:

۱۔ ہم اپنی علاقائی زبانوں کے اثرات نہایت تیزی سے قبول کر رہے ہیں صفحہ ۲۲

۲۔ بگڑے تلفظ کی مضرت رسانی دیکھیے کہ کتنی دہائیاں بیت گئیں مگر آج بھی پنجاب (ہندو پاک) میں ق کو ک جنوبی ہند میں ''ق'' کو ''خ''... بہار کے کچھ اضلاع میں ''ز'' ''ز'' کہا جاتا ہے۔

۳۔ اُردو میں پختگی پیدا کرنے کے لیے عربی کے ساتھ فارسی کا جاننا کہیں زیادہ ضروری ہے۔

۴۔ بغیر قواعد کے اپنی مادری زبان کو بھی ہم نہیں سیکھ پائیں گے۔

شایاں صاحب کے یہ بیانات عوامی اظہار اور عام بول چال کی زبان کے ادبی استعمال کے خلاف ہیں۔ ایسے ہی قواعد نویسوں سے اُردو کے محدود ہو جانے کے صد فیصد خطرے ہیں۔ محی الدین شایاں کو یہ معلوم نہیں کہ اُردو بہ یک وقت علاقائی، قومی، بین الاقوامی اور کسی مخصوص صوبے کی سرکاری زبان بھی ہے۔ اس لیے ان کے اعتراض کے باوجود بھی اس پر علاقائی زبانوں کے اثرات مرتب ہوں گے اور ہو رہے ہیں اور ان اثرات کا مطالعہ نہ صرف تلفظ کی سطح پر بلکہ زبان کے نحوی اور صوتی سطح پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کا ناول ''ایک چادر میلی سی'' کی زبان معیاری اُردو سے دور علاقائی اثر سے مملو ہے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا محی الدین صاحب اس ناول کو علاقائی اور مقامی اثرات میں ڈوبے ہونے کی وجہ سے اسے دوکوڑی کا ناول قرار دے سکتے ہیں؟ قطعی نہیں۔ کیا غالب کی اُردو پر بقول مسعود حسین خاں پنجابی کا اثر نہیں ہے؟ کیا میر کو برج بھاشا اور آگرہ سے الگ کر کے دیکھا جا سکتا ہے؟ ان اثرات کو روکنے کا مطلب اُردو کو کنوئیں کا مینڈک بنانا ہے۔ اس کا مطلب اُردو کو ان علاقوں کے لوگوں کے لیے انتہائی غیر ملکی اور نامانوس زبان بنا دینا ہے۔ ولی دکنی دکنی اُردو بولتے ہوئے ہی شمالی ہند میں آئے ہوں گے لیکن شمالی ہند کی شاعری پر ان کے خاطر خواہ اثرات مرتب ہوئے۔ 'ڑ' کو 'ر' کہنے والا آدمی مخرج کے اعتبار سے بیمار ہو سکتا ہے اور وہ دلّی کا پنجاب کا اور بہار کا یا کہیں اور کا بھی ہو سکتا

www.taemeernews.com

ہے دکن کے لوگ 'ق' کو 'خ' سے بولتے ہیں یہ ان کا جغرافیائی مسئلہ ہے جسے سدھارنے کی ذمہ داری فطرت ہی لے سکتی ہے۔ انگریزی میں 'ت' نہیں ہے عربی میں 'ٹ' نہیں ہے۔ اب انگریز کیا کھاٹا ہے بولے اور عرب ٹ کوٹ سے بدل دے تو یہ اس کا اپنا جغرافیائی مسئلہ ہے اس کے مخرج کا مسئلہ ہے ہمیں ان کے پیچھے ڈنڈا لے کر پڑنے کی کیا ضرورت ہے اور اُردو کے فروغ میں یہ امور کس طرح سے حارج ہیں مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ یہی حال 'ش' اور 'ق' کی رٹ کا ہے جسے اُردو والے ایک اہم مسئلہ سمجھتے ہیں اور غیر اُردو کو اس سے ڈراتے رہتے ہیں اور اسے پڑھاتے غلط طریقے سے ہیں پڑھاتے وقت اسے بڑی اور چھوٹی کہتے ہیں جبکہ انہیں اسے مختلف قسم کی آواز کے طور پر پڑھانا چاہیے اور اس کی Ear Training دینی چاہیے۔ آج کے طالب علموں کو اگر حتمی طور پر محی الدین شایاں کی بات مان کر یہ بتا دیا جائے کہ اُردو جاننے کے لیے فارسی کا جاننا ضروری ہے تو وہ اُردو کی کتاب اسکول میں چھوڑ کر گھر بھاگ جائے گا۔ کبھی ضروری تھا اب نہیں۔ کبھی فارسی اقتدار کی زبان ہندوستان میں تھی اب نہیں۔ اب تو ہندی اقتدار کی زبان ہے اُردو والوں کو ہندی ضرور سیکھنا چاہیے۔ اور اُردو کی ترقی کے لیے اُردو داں طبقہ کو صرف فارسی ہی نہیں اور زبانیں سیکھنی چاہیے۔ رہا سوال قواعد جاننے کا تو آج کے ماہر تعلیم قواعد کو الگ سے پڑھانے کے بجائے خود متن پڑھاتے وقت زبان و قواعد کے جو اصول متن میں نظر آئیں اُسے اُسی وقت عملی صورت میں پڑھانا مستحسن گردانتے ہیں یعنی ان کا زور عملی قواعد پر ہے۔ محی الدین شایاں کو ان باتوں پر بھی فیصلے صادر کرنے سے پہلے نگاہ رکھنی چاہیے تھی۔ اُردو میں عوامی زبان اور ادبی زبان یعنی طبقے کے اعتبار سے کرخنداری اور شرفاء کے لہجے اور زبان کی تفریق کا حتمی تصور بھی زبان کے عوامی لب و لہجے کی تشکیل میں مخل ہے جسے تعصب کی حد تک روا رکھا جاتا تھا اور روا رکھا جاتا ہے۔ مثلاً" میر نے ایک سفر میں اپنے ایک ہم سفر سے پورے سفر میں کوئی بات چیت اس لیے نہیں کی تھی کہ انہیں اپنی زبان بگڑنے کا خدشہ تھا۔ داغ نے اقبال کا ایک شعر سن کر کہا تھا کہ میاں آپ کس زبان میں شعر کہتے ہیں۔ انیس کے بیٹے نے اقبال کی ملاقات کا مذاق اس طرح اڑایا تھا کہ میں دوران گفتگو جی ہاں جی ہاں کرتا رہا اور اقبال ہاں جی ہاں جی کرتے رہے۔ آج اقبال کہاں ہیں اور انیس کے بیٹے کہاں ہیں بتانے کی ضرورت نہیں۔

تلفظ، لہجہ اور روزمرہ کی غلطیاں فطری ہیں کیونکہ اُردو میں نہ کوئی صوتی لغت ہے نہ زبان کا اب تک کوئی لہجہ اور روزمرہ کی رو سے کوئی سروے کیا گیا حالانکہ اس کی پہلی مثال انشاء اللہ خاں

www.taemeernews.com

انشا نے اپنی کتاب ''دریائے لطافت'' میں قائم کی تھی جسے اُردو کا پہلا باضابطہ تہذیبی قواعد قرار دیا جاسکتا ہے جس میں زبان کے تمام تر نکات کو بحث میں لایا گیا ہے۔ مذکورہ بالا تصورات اُردو کے اس ادبی اظہار پر باندھ لگاتے ہیں جسے ہم عام بول چال کی زبان کا ادبی استعمال کہتے ہیں یا جسے ہم عوامی اظہار کا ادبی روپ کہتے ہیں۔ ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ اُردو سندھ میں سندھی، پنجاب میں پنجابی بلوچستان میں بلوچی، راجستھان میں راجستھانی بہار میں بھوجپوری، میتھلی، بنگال میں بنگالی کا اثر لیے ہوئے ضرور ہوگی اور مقامی زبان کے صرف ونحو، افعال اور محاورات کو بلحاظِ ضرورت ضرور قبول کرے گی جس سے اُردو زبان کا جارگن وسیع ہوگا۔ علاقائی زبانوں سے لین دین کی وجہ سے اُردو کو کئی طرح کے فائدے پہنچ سکتے ہیں مثلاً پہلا فائدہ یہ ہوگا کہ جس طرح عربی اور فارسی سے نسبتاً اُردو زبان قریب رہی ہے جس کی وجہ سے ہم عربی اور فارسی کے سینکڑوں الفاظ کو آسانی سے سمجھ لیتے ہیں اور ان زبانوں کو سیکھنے میں ہمیں زیادہ مدت نہیں لگتی اُسی طرح ان زبانوں کے جاننے والے بھی اُردو سے اپنے آپ کو قریب محسوس کرتے ہیں۔ یہی فائدہ علاقائی زبانوں کے اثرات قبول کرنے سے حاصل ہوسکتا ہے اور یہ زبان ان علاقائی زبانوں کے بولنے والے لوگوں کے لیے اجنبی معلوم نہ ہوگی۔ جب ہم ادبی زبان کا تجزیہ کرتے ہیں تو نثر ونظم کے متون میں چند ایسی اسلوبی خصوصیتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں جنہیں ہم بیان وبدیع کی امتیازی شکلوں مثلاً تشبیہ، استعارہ، کنایہ مجاز مرسل، تمثیلی، علامت اور پیکر وغیرہ کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں جن کے استعمال کی وجہ سے ادبی اظہار کا سانچہ تیار ہوتا ہے۔ جب ہم نے فن پارے کے لسانی تجزیے کو موضوع بنانا شروع کیا تو پتہ چلا کہ ادبی زبان کی تشکیل میں ان مذکورہ بالا صنعتوں کے علاوہ نحوی معنیات اور صوتیات کا بھی اہم رول ہوتا ہے۔ مثلاً سرسید نہ کہ صرف تشبیہ اور استعاروں کو اپنی نثر میں استعمال کرتے ہیں بلکہ نحوی سطح پر بھی وہ کچھ اس طرح کے انتخاب کے نمونے پیش کرتے ہیں جس سے ان کی ادبی زبان کی تشکیل ہوتی ہے مثلاً طویل جملے لکھنا، ایک لہجے کی تکرار والے جملوں کو زیادہ استعمال کرنا، صوتی سطح پر رگڑ کھا کر نکلنے والی آوازوں مثلاً ش، خ، ز، ظ کا استعمال زیادہ کرنا وغیرہ۔ میر اسما کے مقابلے افعال کا زیادہ استعمال کرتے ہیں اور ان کے مصرعے نحوی واحدے معلوم ہوتے ہیں۔ پتہ چلا کہ ادبی زبان کی تشکیل میں محض بلاغت کا رول نہیں ہوتا بلکہ بولی جانے والی زبان، عوامی اظہار کا بھی ہاتھ ہوتا ہے مثلاً ادبی زبان میں امثال، محاورے، مترادفات، مرکبات وغیرہ کا بھی اہم رول ہوتا ہے اور محاورے

www.taemeernews.com

اور امثال، کہاوتیں کون نہیں جانتا کہ عوامی اظہار کے بنے بنائے سانچے کا نام ہے۔ لوک ادب میں ان سانچوں سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ لیکن لوک ادب کو ہم ادب کا درجہ دیتے ہوئے کتراتے ہیں کیونکہ اس میں بولی جانے والی زبان کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے جو قیاسی یعنی قواعد کے اصول کے مطابق نہیں ہوتا۔ حالانکہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ زبان کا کوئی حصہ ایسا نہیں جسے منطقی کہا جاسکے اور جس کی عقلی توجیہ وتوضیح ممکن ہو۔ ایسے میں بولی جانے والی زبان یا عوامی اظہار کا ادب سے اخراج ایک ایسے ادبی اظہار کو جنم دینے کے مترادف ہے جو مہمل، چیستاں اور مشکل پسندی کو ہوا دے گا اور زبان وادب کا رشتہ عام قاری سے ختم ہوجائے گا نتیجے میں زبان کا فروغ بھی رک جائے گا۔

کلام میں جس درجہ روزمرہ کی پابندی کم ہوگی اُسی قدر وضاحت کے درجے سے ساقط سمجھا جائے گا۔ حالی کے اس قول میں عوامی اظہار کی اپیل کا منظر نامہ ہے۔

یہاں یہ بتادینا دلچسپی سے خالی نہیں کہ لفظ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ لغاتی لفظ اور قواعدی لفظ لغاتی لفظ طے شدہ بنا بنایا ہوتا ہے۔ قواعدی لفظ وہ ہے جو بنتا رہتا ہے۔ عوامی اظہار کا رشتہ قواعدی لفظ یعنی Auto Sementic سے ہوتا ہے لغاتی لفظ Syn-Semantic سے نہیں۔ مثلاً سا سیرا سے لانگ اور پیرول بھی کہتا ہے۔ اب لانگ کی مثال یہ ہے جیسا کہ یہ جملہ ''وہ یہاں رہتا ہے''۔ پیرول یعنی قواعدی لفظ کی مثال یہ ہے کہ ''وہ مجھے ستاتا رہتا ہے''۔ دونوں میں رہتا ہے کا مفہوم بدل گیا ہے۔ بڑے ادیب عوامی اظہار کے ان سانچوں پر نگاہ رکھتے ہیں۔ ہمارے بڑے شاعروں اور ادیبوں نے ایسے ایسے افعال کا استعمال کیا ہے جو کھڑی بولی کی ذیلی شاخوں میں مستعمل ہے اس طرح انہوں نے اُردو کے جارگن کو وسیع کیا ہے۔ مصحفی، نظیر وغیرہ نے ایک فعل سنگوانا استعمال کیا ہے جس کے معنی محفوظ کرنے کے ہیں۔ اُردو میں اس معنی کو ادا کرنے والا کوئی خالص فعل نہیں ہے۔ لہٰذا خالص فعل کے لیے ان شعرا نے علاقائی افعال کا استعمال جائز سمجھا۔ جہاں تک لہجے کا تعلق ہے ہم سبھی جانتے ہیں کہ اس میں تبدیلی بھی واقع ہوسکتی ہے مثلاً اگر ایک زبان کے بولنے والے ہر خطے کے لوگوں میں اکثر ملنا جلنا ہو تو اُسی قدر ان کا لہجہ بھی یکساں ہوتا چلا جائے گا۔ یہ لہجے، یہ آوازیں کیوں نہ مختلف ہوں کہ زبان ہر بارہ کوس کے بعد بدل جاتی ہے۔ زبان کا علاقہ جتنا بڑا ہوگا اس میں ضمنی لہجے اور بولیاں ہی زیادہ ہوں گی اور وہی بولی معیار بن جائے گی جو سیاسی اقتدار کے قریب ہوگی پتہ یہ چلا کہ زبان کا معیار بھی سیاست کا زائیدہ ہے

www.taemeernews.com

اور قوت کا نمائندہ بھی ایسے میں کسی ایسی بولی کو حقارت سے دیکھنا جس میں معیار برقرار نہیں ایک نئے مسئلے کو جنم دینا ہے جبکہ ہونا یہ چاہیے کہ اسے ہم زبان کے کسی مخصوص لسانی گروہ یا اسلوب کا نمائندہ قرار دے کر اسے اُردو کا سرمایہ سمجھ لیں جیسے انگریزی، امریکن، بلیک انگلش وغیرہ۔

اگر آپ تھوڑا سا اپنے حافظے پر دھیان دیں تو آپ بھی یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ اُردو کی وہ کتابیں، دواوین جن میں عوامی اظہار، اجتماعی حافظے اور اجتماعی شعور کو متحرک کرنے کی صلاحیتیں زیادہ تھیں ان کتابوں اور ان میں پائے جانے والے عوامی اظہار نے اُردو کے فروغ میں اہم حصہ لیا۔ مثلاً

فضلی کی کربل کتھا- قصہ مہر افروز دلبر (عیسوی خاں) رانی کیتکی کی کہانی (سید انشاء اللہ خاں انشاء) تقویت الایمان (شاہ اسمٰعیل شہید) ماسٹر رام چندر کے مضامین - باغ و بہار (میر امن) رسالہ تہذیب الاخلاق- غالب کے اُردو پن سے مملو اشعار- نظیر کی نظمیں- میر کا کلام- مسدسِ حالی، نذیر احمد کے ناول- ترقی پسند تحریک کا عوامی اسلوب اور اس دور کے بیشتر شاعر و ادیب کا کلام- رسالہ زمیندار- وغیرہ وغیرہ

ان کتابوں میں عوامی اظہار کو ادبی مقام تک لے جانے کے نئے اسلوبی راستے تلاش کیے گئے ہیں۔ فضلی نے وہ مجلس ان لوگوں کی تسکین کے لیے لکھی جو فارسی نہیں جانتے تھے اور اُردو بھی ان کی اتنی اچھی نہ تھی۔ قصہ مہر افروز دلبر کا مقصد بھی آسان زبان پیدا کرنا تھا جو عوام میں مشہور و مقبول ہو۔ رانی کیتکی کی کہانی کا مقصد یہ بتانا تھا کہ اُردو کو فارسی و عربی کے سہارے کی ضرورت نہیں۔

مذکورہ بالا متون میں جو خوبی نمایاں طور پر محسوس کی جاسکتی ہے وہ قاری کے وجود اور اس کی ضرورت اور اہمیت کا پاس ہے۔ قاری کی نفسیات پر نگاہ اور ترسیل پر زور ہے۔ مصنف دو طرح کے ہوتے ہیں اوّل وہ جو'' قاری'' سے واقف ہی نہیں ہوتے وہ تو بس لکھتے جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں غالب، شبلی اور ابوالکلام وغیرہ اس کی مثال بن سکتے ہیں دوسرے وہ جن کی ہر وقت نگاہ قاری پر ہوتی ہے یعنی وہ ہمیشہ ٹارگیٹ کو اپنی نگاہ میں رکھتے ہیں۔ میر امن، نذیر احمد، سرسید، حالی، عبدالحق، پریم چند، فرحت اللہ بیگ وغیرہ اس قسم کی مثال بن سکتے ہیں۔

قاری کی اہمیت کا اندازہ سب سے زیادہ ترقی پسند ادب کے مطالعے کے وقت ہوتا ہے یہاں قاری کے افتادِ طبع، پسند و ناپسند کا متن کی تخلیق میں اہم رول نظر آتا ہے۔ دیکھا جائے تو متن بغیر قاری کے کیا ہے؟ یہ قاری ہے جو متن کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر رکھتا ہے اس لیے

www.taemeernews.com

زبان وادب کے فروغ کے راستے اس وقت تک استوار نہیں ہو سکتے جب تک کہ ہم اپنے قارئین کے مراتب کو تسلیم نہ کریں۔

عوامی اظہار کا مطلب ادب میں آسان لفظوں کا استعمال محض کا نام نہیں ہے۔ اخبار نویسی یا نعرہ بازی نہیں ہے بلکہ اپنے پڑھنے والوں اور متن سے تخلیقی رشتہ پیدا کرنے کا نام ہے۔ یہ رشتہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم مروّجہ زبان کا ایک ایسا تخلیقی استعمال کرتے ہیں کہ پڑھنے والا یہ سوچنے لگے کہ گویا یہ بھی ہمارے دل میں تھا مگر خود لکھنا چاہے تو لکھ نہ سکے۔ یعنی متن میں ایسی سادگی اس استعمال سے آجاتی ہے جسے فنِ تعمیر میں تاج محل کی سادگی یا ہیرے کی سادگی کہتے ہیں۔ اس اسلوب میں ایسی معصومیت ہوگی اور تصنع سے حد درجہ دوری ہوگی جس طرح جنگل میں اُگے پھول میں ہوتی ہے۔

ادب میں اس اظہار پر زور اس لیے دیا جاتا ہے کہ ادب ایک اختصاصی میدان نہ بن جائے جس طرح کمپیوٹر کہ جو کمپیوٹر نہ جانتا ہو وہ کمپیوٹر بالکل ہی نہیں سمجھ پاتا۔

آج شعر وادب کی بے مصرفی سے کون واقف نہیں۔ فی زمانہ ادبی ذوق کا زوال کس قدر ہو رہا ہے بتانے کی ضرورت نہیں، ایسے میں ترقی پسند ادب کو دھکیل کر جدیدیت کی بحالی نے اس زوال کو اور گہرا دیا تھا۔ جدیدیت نے ایک ایسے ادب کا تصور پیش کیا جو سراسر عوامی اظہار کے منافی تھا۔ اس ادب کا سب سے بڑا المیہ اپنے قاری سے کٹ جانا تھا۔ بیشتر ادیب اپنے قارئین سے بے نیاز ہوئے تھے اور بقول ایک شاعر:

بہت خوب ہے قولِ ہادی عزیز
کہ میں شعر کہتا ہوں اپنے لیے

کے مصداق ہو گئے تھے۔ نتیجتاً زبان و ادب کا فروغ اس سے کتنا متاثر ہوا بتانے کی ضرورت نہیں۔

قاری جب تک متن سے نہیں ٹکراتا متن کی معنویت دو چند نہیں ہوتی۔ متن علاقے سے ہو کر ملک اور ملک سے ہو کر بیرونِ ملک تک مشہور نہیں ہوتا۔ ترجمے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ دوسری ایڈیشن کی ضرورت پیش نہیں آتی کیونکہ کتاب کی خرید و فروخت ماند پڑ جاتی۔ اس زبان کے ادیب دوسری زبانوں کے لیے اجنبی بن جاتے ہیں اور زبان وادب کے راستے مسدود

www.taemeernews.com

ہو جاتے ہیں۔ جو ادیب عوامی اظہار پر اور اس کی تعمیر کے اہم عنصر قاری پر نگاہ رکھتے ہیں وہ اپنے قارئین کی قرأت کا استعارہ بن کر ملک و بیرونِ ملک میں اپنی زبان و ادب کی نمائندگی کرتے ہیں۔

ضرورت سے زیادہ کسی زبان کا کسی بااثر زبان کی تقلید سے عوامی اظہار کو شدید نقصان پہنچتا ہے۔ فارسی و عربی کی ضرورت سے زیادہ تقلید نے اُردو زبان کے فطری اسلوب کو نقصان پہنچایا۔ میرے تجزیے کے مطابق اس تقلید نے اُردو افعال کے تخلیقی استعمال کو پسِ پشت ڈال دیا یہ بات اس وقت آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے جب ہم اُردو کے ان ادیبوں کے متون کا تجزیہ کرتے ہیں جن کے اسلوب میں فطری اُردو اور دیسی پن زیادہ ہے اور یہ اس لیے ہے کہ انہوں نے اسماء جو کسی زبان سے بھی مستعار لیے جاسکتے ہیں کہ مقابلے افعال کا گوناگوں استعمال یعنی فعلیہ اسم، اسم بطور صفت، افعال بطور اسم ظرف و مظروف وغیرہ کے کیا۔ مثلاً میر کے کلام اور غالب کے کلام میں بنیادی فرق یہی ہے کہ میر پراکرت سے جڑے ہوئے ہیں اور غالب 'تقلید' 'تتبع' توارد کے شکار اس لیے نظر آتے ہیں کیونکہ انہوں نے افعال کا تخلیقی استعمال بہت کم کیا ہے اور جہاں کیا ہے وہی اشعار غالب کی پہچان بن گئے ہیں۔ مثالیں آپ کے سامنے ہیں۔

عوامی اظہار سے اجتناب اور دقیق رنگین اسلوب یا مرصع مقفّیٰ اسلوب کی پیروی ایک نفسیاتی عمل بھی ہے اور سیاسی عمل بھی۔ جو مصنف کسی نہ کسی احساسِ کمتری کا شکار ہوتا ہے اور سماجی و معاشی سطح پر کمزور ہوتا ہے اس کے لیے طاقت لسانی اور مفرس بیانی یعنی زبان کے مظاہرے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ یعنی اس کی وجہ طبقاتی شعور کا ادب میں حد درجہ پیدا ہونا ہے۔ فطری بات ہے ایسے لوگ اپنے طبقے میں اوپر اٹھنے کے لیے طاقتِ لسانی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ فصیح و غیر فصیح کا تصور بھی جتنا سیاسی ہے اتنا لسانی نہیں جس پر سخت رویہ اختیار کرنے سے زبان و ادب کے فطری ارتقا کے عمل کو شدید نقصان پہنچ سکتا ہے۔

●●●

www.taemeernews.com

شکیل اختر

اُردو کے فروغ میں نشریاتی ادب کا حصہ

ہندوستان میں باقاعدہ نشریات کا آغاز پہلی جنوری ۱۹۳۶ء کو ہوا۔ اس سے قبل ہندوستان میں نشریات کا سلسلہ بکھرا ہوا تھا۔ ہندوستان میں نشریات کے آغاز سے ہی نشریاتی ادب کے ہلکے ہلکے نقوش ابھرنے لگے تھے اور مختصر مدت ہی میں اس نے ادب کے وسعت اور امکانات میں بے حد اضافہ کیا اس کی سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ ریڈیو میں ابتدا ہی سے اُردو زبان کو ایک کلیدی حیثیت حاصل رہی ہے اور تمام اہم مراکز سے اسی زبان میں پروگرام نشر کیے جاتے تھے۔ دوسری طرف ہندوستان میں نشریات کے آغاز ہی میں پطرس بخاری اور ذوالفقار بخاری جیسے اُردو داں حضرات نے جہاں ریڈیو نشریات کو مستحکم کیا وہیں اِن دونوں بھائیوں نے غیر دانستہ طور پر نشریاتی ادب کی روایت کا آغاز بھی کیا اور چن چن کر اُردو داں حضرات کو اس نئے میڈیم سے روشناس کرایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُردو میں نشریاتی ادب کی داغ بیل پڑنے لگی اور گذشتہ صدی کے اختتام تک اس میں ادب کا ایک وسیع ذخیرہ ہوگیا جس نے عمومی طور پر اُردو ادب کی ترویج میں نمایاں حصہ لیا اس موضوع پر مزید گفتگو سے قبل آگے ایک نظر ڈالتے ہیں نشری اور غیر نشری ادب کے فرق پر۔

غیر نشری ادب صرف پڑھے لکھے لوگوں کے لیے ہوتا ہے جبکہ نشری ادب کی رسائی عام لوگوں تک ہوتی ہے۔ غیر نشری ادب کا پڑھنے والا ایک مخصوص طبقہ ہوتا ہے۔ اس ادب کے تخلیق

www.taemeernews.com

کار کسی بھی شہ پارے کو لکھتے وقت قاری کے فکری تہذیبی اور معاشرتی سطح کا خیال نہیں رکھتے بلکہ جوں ہی کوئی خیال ذہن میں آیا اسے صفحہ قرطاس پر بکھیر دیا جاتا ہے اس کے برعکس ریڈیو کا ایک معمولی پروگرام بھی نشر ہونے سے قبل کئی مرحلوں سے گزرتا ہے اور اس کی تیاری برسہا برس پہلے سے ہوتی ہے نشری شہ پارے کو براڈ کاسٹ کرنے سے قبل اس بات کا یقین کرنا پڑتا ہے کہ سننے والوں کا تعلق معاشرے کی کس سطح سے ہے۔ ان کی نفسیات اور دلچسپی کیا ہے۔ نشریاتی ادب میں زبان و بیان کا خاص خیال رکھا جاتا ہے جبکہ غیر نشریاتی ادب میں بھاری بھرکم الفاظ کے استعمال کی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ نشریاتی ادب دراصل دریا میں کوزے کو بند کرنے کا نام ہے کیوں کہ یہاں وقت کی پابندی از حد ضروری ہے۔ اس ادب سے تعلق رکھنے والے تخلیق کار کو اگر اپنے موضوع پر پورا عبور حاصل نہ ہو تو تقریر لکھنی مشکل ہو جاتی ہے۔

نشریاتی ادب کا مفہوم:

نشریاتی ادب کسی بھی نشری ادارے کے ذریعہ پیش کیے جانے والے وہ پروگرام ہیں جنہیں نشریاتی اصولوں، تقاضوں اور بنیادی ادبی خصوصیات کو مدنظر رکھ کر تیار کیا جاتا ہے۔

عمومی طور پر ادب سے متعلق وہ پروگرام جو ریڈیو کے ذریعہ نشر کیا جاتا ہے وہ نشریاتی ادب کہلاتا ہے۔ دنیا کے تمام نشری ادارے اپنی مخصوص پالیسی کے تحت پروگرام نشر کرتے ہیں جس کا اطلاق ادبی پروگراموں پر بھی ہوتا ہے۔ ہندوستان میں چونکہ جمہوری طرزِ حکومت ہے اس لیے یہاں آزادانہ فضا میں نشریاتی ادب کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ ریڈیو پروگرام کے ابتدا سے ہی ادبی پروگراموں کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے اور تقریباً تمام اہم مراکز سے اُردو کے ادبی پروگرام آج بھی نشر کیے جا رہے ہیں اور یہ سلسلہ ابتدائی دور سے ہی رواں دواں ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے نشریاتی ادب کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ ہو گیا۔

نشریاتی ادب عمومی طور پر وہ ادب ہے جس کی ترسیل معاشرے کی نچلی سطح تک ہوتی ہے۔ غیر نشریاتی ادب نے جس کام کو ایک طویل مدت میں نہیں کیا اسے نشریاتی ادب نے قلیل مدت میں کر دکھایا۔ مثال کے طور پر اُردو کے مشہور و معروف شاعر غالب کو ہی لے لیجیے، غیر نشریاتی ادب میں ان پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ ان کے اشعار کے تفہیم میں بھی خوب خوب گل بوٹے کھلائے گئے ہیں۔ اس کے باوجود غیر نشری ادب غالب کو عوام کی سطح پر متعارف نہیں کرا سکی جبکہ نشریاتی ادب نے بہت مختصر مدت میں غالب کو نہ صرف معاشرے کے عمومی حلقے سے متعارف

www.taemeernews.com

کرایا بلکہ وہ لوگ بھی اس کے دیوانے بن گئے جن کو اُردو نہیں آتی ہے لیکن غالب سے متعلق کچھ حد تک جانکاری ضرور رکھتے ہیں۔ ایک اور بات کا یہاں ذکر کرتا چلوں کہ ریڈیو سے قبل موسیقی درباروں تک محدود تھی اور ایک وقت ایسا آیا جب جاگیرداری ختم ہوگئی تو موسیقاروں کی سرپرستی بھی ختم ہوگئی لیکن ریڈیو نے اس فن کو بھی جلا بخشی اور اسے درباروں سے نکال کر گلی کوچوں میں پہنچا دیا اور عام لوگوں میں موسیقی کا ذوق بھی پیدا کیا۔ نشریاتی ادب نے اس موسیقی کے ذریعہ بھی مختلف شاعروں کو عوام سے متعارف کرایا ہے۔

اُردو میں نشریاتی ادب کی تاریخ کا اگر اجمالی جائزہ لیا جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ اُردو کا ہر معروف ادیب یا تو ریڈیو کے اسٹاف میں رہا ہے یا ریڈیو سے باہر رہ کر اس کے لیے لکھا ہے ایسے شعرا و ادبا کی ایک طویل فہرست ہے جن کا ذکر آگے آئے گا تاہم نشریاتی ادب کی پوری تاریخ کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

اوّل ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک۔ دوئم ۱۹۴۷ء سے تا حال:

اوّل دور میں ہندوستان کا نشریاتی ادب اور خصوصاً اُردو کا نشریاتی ادب تجربے کے دور سے گذر رہا تھا۔ اس زمانے میں جن لوگوں نے ریڈیو کے لیے لکھا ان کے سامنے نشریاتی ادب کی کوئی روایت موجود نہیں تھی۔ دوسری طرف انگریزی ادب کا دامن بھی ان موتیوں سے خالی تھا۔

ہندوستان میں ریڈیو نشریات کے آغاز ہی سے نشریاتی ادب کے نقوش کا پتہ چلتا ہے لیکن بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ آج تک نشریاتی ادب کی جانب خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ اُردو میں نشریاتی ادب کی روایت بہت پرانی ہے۔ اس کا آغاز ۱۹۳۰ء کی دہائی میں ریڈیو نشریات کے ساتھ ہوا۔ (اب تک) اُردو میں ریڈیائی تقریروں کا جو مجموعہ کتابی صورت میں منظرِ عام پر آچکا ہے اس کے مطابق ۳؍اکتوبر ۱۹۲۹ء کو اُردو میں پہلی بات چیت ملا واحدی کی نشر کی گئی تھی جس کا موضوع تھا مصورِ غم مولانا راشد الخیری کی یہ تقریر ''کیا خوب آدمی تھا'' سلسلہ تقاریر کے تحت نشر کی گئی تھی۔ اس سے قبل ریڈیو میں تقریریں تو نشر ہوئی ہیں لیکن اب اس کا مسودہ کہیں محفوظ نہیں ہے اور نہ اس کے حوالے ملتے ہیں۔ طباعت کی صورت میں مذکورہ کتاب اُردو کی پہلی ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ ہے۔

ہندوستان میں ریڈیو نشریات کے آغاز میں عام طور پر اُردو داں طبقے نے اس نئے میڈیم کی جانب لبیک نہیں کہا مگر بالخصوص ایک طبقے نے اس کی اہمیت کو سمجھا اور اسے اظہار کے ایک وسیلے کے طور پر قبول کیا۔

www.taemeernews.com

سید ذوالفقار علی بخاری اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں:

'' آغا اشرف کو ساتھ لے کر ہر ایک کے درِ دولت پر حاضری دی اور بصد التماس ریڈیو پر تقریر کرنے کے لیے رضا مند کیا۔ ڈاکٹر انصاری، خواجہ حسن نظامی، بھائی آصف علی، مرزا محمد سعید، نواب خواجہ عبدالمجید، ڈاکٹر ذاکر حسین، بیگم سر بلند جنگ، آغا شاعر قزلباس، شمس العلما مولوی عبدالرحمٰن، منشی پریم چند، مرزا فرحت اللہ بیگ، پرنسپل رشید احمد صدیقی کس کس کا نام گناؤں۔ یہ تھے ہمارے مستقل طور پر تقریر نشر کرنے والے حضرات ، لاہور میں ابھی ریڈیو جاری نہیں ہوا تھا مگر سالک اور امتیاز کے بغیر محفل سونی ہو جاتی تھی۔ چنانچہ انتظام یہ کیا گیا کہ یہ حضرات لاہور سے ٹیلی فون پر بولیں اور دہلی سے ہم ان کی تقریر ریلے کریں گے۔ سالک صاحب افکار وحوادث اور امتیاز چچا چھکن لے کر اس بزم میں شریک ہوتے۔

(سرگذشت سید ذوالفقار علی بخاری صفحہ ۱۵۴ ایڈیشن ۱۹۹۵)

اسے خوش بختی ہی کہا جائے گا کہ ہندوستان میں نشریات کے اولین دور میں پطرس بخاری جیسا ادیب اور ذوالفقار بخاری جیسے صاحبِ نظر عہدیدار ملا ان دونوں بھائیوں نے ہندوستان میں نشریات کا ایک جامع نٹ ورک تیار کیا۔ کمال احمد صدیقی نے اپنی کتاب میں ذوالفقار علی بخاری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

'' یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ذوالفقار علی بخاری نے ہی اُس وقت کے نامور ادیبوں، دانشوروں، شاعروں اور فنکاروں کو نشریات سے روشناس کرایا اور لکھنے پڑھنے والوں کو مروجہ لکھنے کی زبان کے بجائے بولنے کی زبان کی اہمیت سے آگاہ کیا اور اسی زبان میں نشریات کے مسودے مرتب کرنے پر آمادہ کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ نشریات کی ایجاد زبان کو از سرِ نو تازگی اور حرارت دے کر اسے اپنے اصل مرتبہ پر فائز کرے گی''۔

آزادی سے قبل آل انڈیا ریڈیو سے پروگرام عموماً اُردو میں ہوا کرتے تھے جسے ہندوستانی کہا جاتا تھا۔ رفعت سروش نے اپنے مضمون میں ریڈیو سے وابستہ لوگوں کا ذکر کیا ہے جن کے نام یہ ہیں۔

www.taemeernews.com

''پطرس بخاری، ن-م-راشد، میرا جی، مختار صدیقی، اسرارالحق مجاز، راجہ مہدی علی خاں، تابش دہلوی، انصار ناصری، فضل حق قریشی، راز مرادآبادی، شوکت تھانوی، سلام مچھلی شہری، کرتار سنگھ دگل، عشرت رحمانی، وشوامتر عادل، شہزاد لکھنوی اختر الایمان، ممتاز مفتی، اشفاق حسین، حفیظ ہوشیار پوری، ضیاء جالندھری، اعجاز بٹالوی، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، لالہ مہیشور دیال، حبیب تنویر، فارغ بخاری اور رفعت سروش''۔ بحوالہ (آل انڈیا ریڈیو کی اُردو خدمات از رفعت سروش، سہ ماہی قصے، جنوری تا جون، صفحہ ۱۲۲، سال ۲۰۰۱)

اب اُن لوگوں کا ذکر سنئے جنہوں نے ریڈیو کے لیے تقریریں لکھیں اور اسے کتابی صورت میں چھپوا کر محفوظ بھی کیا۔ ایسے لوگوں میں سرفہرست نام مصور فطرت خواجہ حسن نظامی کا ہے۔ ان کی نشری تقریروں کا مجموعہ'' کان'' باقی ہے جس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے خواجہ حسن نظامی کو ریڈیو کے لیے استعمال کی جانے والی زبان کا اچھا خاصا شعور تھا۔ اس کے ساتھ ہی انھیں ناک پڑھنے کا بھی فن خوب آتا تھا۔ خواجہ حسن نظامی سے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے کمال احمد صدیقی لکھتے ہیں:

'' وہ (خواجہ حسن نظامی) ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے آل انڈیا ریڈیو کے آغاز سے پروگراموں میں شرکت کی بلکہ جن کے اسلوب نے ریڈیو کے لیے دوسرے نوخیز لکھنے والوں کو بھی راستہ دکھایا''۔

خنداں: سال اشاعت ۱۹۴۰ صفحات ۳۸۱:

یہ رشید احمد صدیقی کی اُن مختصر تقریروں کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات میں آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوئیں ان کی تعداد چالیس ہیں۔ خنداں نشریاتی ادب کی ایک اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کے تمام مضامین نشریاتی تقاضوں کو مدنظر رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ اس کے مضامین میں کہیں گہرے طنز کا احساس ہوتا ہے تو کہیں کہیں رشید احمد صدیقی کا طنزیہ اسلوب سطحی ہو گیا ہے۔

ادب کیا ہے:

یہ نورالحسن ہاشمی کی ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ ہے جس میں ۱۶ نشری مضامین ہیں۔ یہ تمام تقاریریں آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے نشر ہو چکی ہیں۔ تمام کے تمام مضامین ادبی موضوعات پر ہیں اور نہایت ہی دلچسپ پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں۔

www.taemeernews.com

تنقیدی اشارے:

آلِ احمد سرور اُردو کے ایک مقبول ناقد کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ انہوں نے اُردو ادب کے تنقیدی سرمائے میں اپنی تخلیقات کے ذریعہ اضافہ کیا ہے۔ آل احمد سرور آل انڈیا ریڈیو کے مختلف پروگراموں میں دلچسپی سے شرکت کرتے تھے ان کا تعلق بھی آزادی سے قبل ریڈیو کے لیے مختلف نوع کی تقریر لکھنے والوں میں سے تھا۔ انہوں نے بے شمار تنقیدی مضامین احبابِ ریڈیو کی فرمائش پر لکھے تھے۔ ان کی نشری تخلیقات اکثر و بیشتر رسائل کی زینت بھی بنتی رہی ہے۔ ایسی ہی ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ تنقیدی اشارے ہیں۔ اس میں شامل مضامین ریڈیو کے لیے لکھے گئے تھے لیکن دوسرے ایڈیشن میں چند مضامین کا اضافہ کیا گیا۔

ریڈیو نے ابتدائی دور سے ہی ادب کی مختلف اصناف کو اپنے دامن میں سمیٹنا شروع کر دیا تھا اور اُس پر گہرے اثرات بھی مرتب کیے۔ ابتدائی دور میں جب تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا تو مختلف نوع کی ادبی تقریریں نشر کی گئیں جن میں کچھ خاکے بھی تھے مگر اس وقت اسے ایک علیحدہ صنف کے طور پر نشر نہیں کیا گیا مگر یہ خدوخال کے اعتبار سے خاکے کے زمرے میں آتے ہیں اس سلسلے میں ڈاکٹر صابرہ سعید اپنی کتاب میں لکھتی ہیں۔

> ''۱۹۲۹ء میں آل انڈیا ریڈیو سے چند مضامین نشر کیے گئے جو راشد الخیری، ڈپٹی نذیر احمد، چکبست اور داغ سے متعلق تھے۔ راشد الخیری کا خاکہ ملا واحدی نے لکھا تھا لیکن باقی مضامین، خاکوں سے زیادہ سوانحی مضامین کے ذیل میں آتے ہیں بحوالہ'' اُردو میں خاکہ نگاری'' ڈاکٹر صابرہ سعید''۔

ہوا کے دوش پر:

یہ غلام ربانی تاباں کی ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ ہے۔ انہوں نے ریڈیو کے لیے بہت سارے مضامین اور خاکے لکھے متذکرہ بالا کتاب میں پانچ ادبی خاکے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف ادبی موضوعات پر پانچ تقریریں اور چھ فیچر شامل ہیں۔ یہ تمام تر تخلیقات آل انڈیا ریڈیو کی اُردو سروس اور اُردو مجلس سے نشر ہوئی ہیں۔

انتخاب مضامین مرزا محمود بیگ:

یہ کتاب مرزا محمود بیگ کے نشری تقریروں اور فیچروں کا مجموعہ ہے۔ انہوں نے آل انڈیا

www.taemeernews.com

ریڈیو کے لیے مختلف موضوعات پر تقریریں لکھیں۔ ان تقریروں کا مجموعہ مضامینِ محمود ہے جس میں خاکے اور ہلکی پھلکی مزاحیہ تقریریں بھی ہیں۔ یہ تقریریں بھی ہمارے نشریاتی ادب کا ایک اہم حصہ ہیں۔ اس مجموعے میں تیرہ فیچر بھی ہیں جنھیں مرزا محمود بیگ نے بغاوت ہند کی سالگرہ کے موقعہ پر ۱۹۵۷ء میں لکھا تھا۔ ان فیچروں کا عنوان دلّی اور اس کے گلی کوچے ہیں یہ کتاب نشریاتی ادب کی ایک اہم کڑی ہے۔ ریڈیائی تقریروں اور خاکوں کی اس کتاب کے علاوہ بہت سی تقریریں اور خاکے اُردو کے مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں عملی دشواری یہ ہے کہ ان مضامین میں بہت کم ایسے ہیں جنھیں ریڈیو کے حوالے کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔

ادبی فیچر اور تقریریں:

پروفیسر ڈاکٹر مظفر حنفی کی یہ کتاب نشریاتی ادب کی ایک اہم کتاب تصور کی جاتی ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے میں خالص ادبی موضوعات پر ۹ فیچر ہیں جبکہ دوسرے حصے میں ۱۷ نشری تقریریں ہیں۔ اس کے علاوہ جگن ناتھ آزاد کی کتاب نشانِ منزل میں چودہ مقالات اور ۹ ریڈیائی مضامین شامل ہیں۔

ادب کی پرکھ:

یہ کتاب ڈاکٹر نریش کے مقالات کا مجموعہ ہے جس میں ریڈیائی مضامین بھی ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے تعلیمی خطبات میں بھی ریڈیائی مضامین شامل ہیں۔ پروفیسر محمد مجیب کی کتاب دنیا کی کہانی، خواجہ غلام السیدین کی کتاب داستانِ اشک وخون قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ چند مشہور زمانہ تقریری سلسلوں کا ذکر بھی کرنا بے جا نہیں ہوگا۔

بھلائے نہ بنے سلسلۂ تقاریر کے تحت اُردو سروس سے مشرق ومغرب کی شہرہ آفاق تصنیفات کے ان اہم کرداروں پر ۲۰ ایسی تقریریں نشر کی گئیں جو سامعین کے ذہن پر گہرا نقش چھوڑ گئیں اوراقِ مصور کے تحت ادب کی اہم تصنیفات پر مبنی سلسلہ تقاریر آسماں کیسے کیسے، اُردو ہے جس کا نام، رودادِ قفس (زندانی ادب سے متعلق سلسلہ تقاریر) جدید ادبی رجحانات/ اے عشق اجل گہر/ یہ خلد بریں ارمانوں کی/ غالب بصد انداز وغیرہ وغیرہ۔

ریڈیو ڈراما:

ہندوستانی نشریات میں ریڈیو ڈرامے کا تصور روزِ اوّل سے ہی رہا ہے ہندوستان میں ریڈیو ڈرامے کی شروعات سے قبل بی بی سی بھی ریڈیو ڈرامے نشر کر چکا تھا۔ اس کی مدت یعنی

www.taemeernews.com

دورانیہ کافی لمبا ہوتا تھا ہندوستان میں بھی اسی نہج پر ریڈیو ڈرامے نشر کیے گئے جس کی دورانیہ دو سے تین گھنٹے تک ہوتا تھا۔ ذوالفقار بخاری اور پطرس بخاری نے اس طرح کے ڈرامے کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ ڈرامہ صرف آدھ گھنٹہ سے ایک گھنٹہ تک کا ہونا چاہیے۔ اس میں طویل مکالمے اور کرداروں کی بھرمار نہ ہو۔ جس دور میں ریڈیو ڈرامے کا آغاز ہوا اس وقت تھیٹر کا چلن عام تھا۔ سید ذوالفقار بخاری جب بمبئی ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر بنا کر بھیجے گئے تو اس وقت تھیٹر کافی مقبول تھا۔ انہوں نے اپنی خودنوشت میں ایک جگہ لکھا ہے۔

> ''بمبئی میں ڈرامہ پیش کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں تھیٹر وہاں بچے بچے کی گھٹی میں پڑا ہے اور فلم ایکٹر اور فلم کمپنیوں کی بھرمار ہے۔ مگر میں نے ہمت نہ ہاری اور نہایت انہماک سے ڈرامے کیے دہلی سے کچھ ایکٹر ساتھ لے گیا ان میں شکیل احمد اور رونق کے نام قابل ذکر ہیں۔''
>
> (بحوالہ سرگذشت! سید ذوالفقار بخاری صفحہ ۲۲۵ ایڈیشن ۱۹۹۵ء)

آل انڈیا ریڈیو کے ساتھ شروع ہی سے یہ المیہ رہا ہے کہ کوئی بھی پروگرام نشر ہونے کے بعد اس کے مسودے کو محفوظ نہیں رکھا جاتا بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ مسودے کے تحفظ کا کوئی نظام نہیں ہے جس کی وجہ سے نہایت قیمتی مسودے بھی زمانے کے ہاتھوں برباد ہوگئے ان مسودوں میں سے چند ایک کو کسی نے اپنی ذاتی دلچسپی کی بنیاد پر شائع کرادیا اور بالخصوص ریڈیو ڈرامے کی اسکرپٹ کو اسٹیج ڈرامے میں تبدیل کر کے شائع کرایا گیا جس کی وجہ سے ریڈیو ڈرامے کے معیار کو متعین کرنے میں خاصی دشواری پیش آئی ہے۔

گذشتہ دو تین دہے میں چند ایسے لکھنے والے بھی سامنے آئے ہیں جو صرف ریڈیو کے لیے لکھتے ہیں اور پھر اسے کتابی صورت میں من وعن شائع بھی کرتے ہیں۔ ریڈیو کے اوّل دور کے اُردو ریڈیو ڈرامے جو کتابی صورت میں محفوظ ہیں کہ علاوہ باقی سب زمانہ کے ہاتھوں برباد ہوگئے کچھ پرانی ریکارڈنگ آل انڈیا ریڈیو کی آرکائیوز میں محفوظ ہے جہاں عام آدمی کی رسائی ممکن نہیں۔

ریڈیو ڈرامے کی تاریخ پر اگر نظر ڈالی جائے تو سب سے پہلا نام! ادارے سے وابستہ شخص سید ذوالفقار علی بخاری کا آتا ہے۔ انہوں نے ریڈیو کے لیے ڈرامہ تو نہیں لکھے لیکن ڈراموں میں اداکاری ضرور کی۔ وہ ریڈیو ڈرامے کے رموز ونکات سے بخوبی واقف تھے انہوں نے اس دور میں ریڈیو کے لیے ڈرامہ لکھنے والوں کو اس فن سے آشنا کیا اور اداکاروں کی تربیت

www.taemeernews.com

بھی کی۔کمال احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ:

''ذوالفقار اسٹیج ڈراموں کے ماہر ہونے کے باوجود اسٹیج ڈراموں کی تکنیک کو ریڈیو سے الگ رکھ کر جدید ریڈیو ڈرامے کے موجد بنے اُردو میں ریڈیو کی اس صنف میں پہل کرنے کا نام انہی کا رہے گا''۔

(بحوالہ: اُردو ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل و ابلاغ کی زبان: ڈاکٹر کمال احمد صدیقی صفحہ ۴۴۲، ۱۹۹۸)

کرشن چندر:

کرشن چندر ۱۹۳۹ء میں ریڈیو کے ملازم ہوئے اور اسسٹنٹ کے طور پر نو سال تک کام کیا پھر فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے۔آل انڈیا ریڈیو میں اپنی ملازمت کے دوران انہوں نے خاص طور سے ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھے۔ان کے ڈراموں کا مجموعہ دروازہ کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔اس مجموعے میں شامل ڈراموں کے عنوانات ہیں:

۱۔سرائے کے باہر، ۲۔قاہرہ کی ایک شام، ۳۔دروازہ کھول دو۔آل انڈیا ریڈیو کی اُردو سروس میں کرشن چندر کے لکھے ہوئے ڈرامے کی ریکارڈنگ موجود ہے۔یہ ہیں: ایک روپیہ ایک پھول، کتے کی موت اور سرائے کے باہر، لیکن ان ڈراموں کی کوئی اسکرپٹ موجود نہیں ہے۔

سعادت حسن منٹو:

آج کی اُردو دنیا سعادت حسن منٹو کو ایک افسانہ نگار کے طور پر جانتی ہے لیکن وہ ایک عرصے تک ریڈیو سے وابستہ رہے اور بے شمار ڈرامے لکھے۔عشرت رحمانی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ:

''سعادت حسن منٹو ۱۹۳۹ میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ڈرامہ نگار کی حیثیت سے ملازم ہو کر آئے اور نشری تکنیک کے اعلیٰ نمونے پیش کرنے لگے۔متعدد کامیاب ڈرامے لکھے اور اچھوتی آواز میں اپنے کمالات سے ریڈیو کو نیا اسلوب بخشا۔ان کے نشری ڈرامے یہ ہیں:

۱۔کروٹ، ۲۔ماچس کی ڈبیا، ۳۔اتوار، ۴۔خودکشی، ۵۔نیلی رگیں، ۶۔رندھیر پہلوان، ۷۔تین موٹی عورتیں، ۸۔آؤ، مسلسل خاکے، ۹۔محبت کی پیدائش، ۱۰۔میپولین کی موت، ۱۱۔قلوپطرہ کی موت، ۱۲۔منٹو کے ڈرامے اور جنازے (بحوالہ اُردو ڈرامے کی تاریخ و تنقید)

www.taemeernews.com

اپندر ناتھ اشک:

اپندر ناتھ اشک کا تعلق ریڈیو سے بڑا گہرا رہا ہے۔ یکم جون ۱۹۶۱ء کو آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہوئے۔ دورانِ ملازمت انہوں نے ایک سے ایک کہانیاں اور ڈرامے لکھے صبح وشام کے عنوان سے انجو کا ایک ایکٹ اور ازلی راستے کے عنوان سے دو ایکٹ کے ڈرامے لکھے۔ ان کی زیادہ تر اسکرپٹ زمانہ کے ہاتھوں برباد ہو چکی ہیں جس کی وجہ سے پوری تفصیل کا پتہ نہیں چل پایا۔

میاں لطیف الرحمن:

ایک مدت تک آل انڈیا ریڈیو میں ملازم رہے اور آخر میں ڈائریکٹر پروگرام کی حیثیت سے مستعفی ہوئے۔ انہوں نے ۱۹۳۵ء میں لکھنؤ ریڈیو کے لیے پہلا ڈرامہ لکھا لطیف صاحب کے خاص نشری ڈرامے حسب ذیل ہیں:

شادی کا پیغام، قیدی، گلدان، دوزخ، پس منظر، چندر گپت، شیر شاہ کا انصاف، چلتی گاڑی، غرناطہ کا مجاہد، عمر خیام، نور جہاں، رقاصہ (نشری اوپیرا شوکت تھانوی کے ساتھ مل کر لکھا) یہ ڈرامے اب تک کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے ہیں۔

اس کے علاوہ مرزا عظیم بیگ چغتائی اور گوہر شادانی کے ڈرامے بھی اکثر ریڈیو سے براڈ کاسٹ ہوتے رہے ہیں۔

رفیع پیرزادہ:

نشریات کی دنیا میں انھیں رفیع پیر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ قیام پاکستان سے قبل آل انڈیا ریڈیو کے مختلف اسٹیشنوں کے لیے متعدد کامیاب و دلچسپ ڈرامے لکھے وہ ریڈیو میں ڈرامے کے پہلے پروڈیوسر تھے جنہیں ۱۹۳۶ء میں ریڈیو ڈرامے کی تکنیک کی جانکاری کے لیے جرمنی بھیجا گیا تھا جن کے ڈرامے نے نشریاتی ادب میں بالخصوص اور بالعموم اُردو ادب کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ ان کے لکھے اور پروڈیوس کیے ہوئے جو ڈرامے زیادہ مقبول ہوئے وہ یہ ہیں۔

لیلے، عقبیٰ کا میدان، ناموس، دیوانہ یکا رخویش، ولے بخیر گذشت، سناٹا، تصادم، اوتار، راز و نیاز، مار آستیں، ساز باز، تکمیل جرم اور القاب۔

شوکت تھانوی:

ملک کے مقبول ترین مزاح نگار تھے۔ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے منشی جی اور ریڈیو پاکستان کے قاضی جی کے نام سے کافی شہرت حاصل کی۔ شوکت تھانوی نے ۱۹۳۸ میں آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ

www.taemeernews.com

کے لیے اپنا پہلا ڈرامہ ''خدا حافظ'' لکھا۔ اس کے بعد لکھنؤ اسٹیشن کے عملے میں مصنف اور اداکار اور پروڈیوسر کی حیثیت سے شامل ہوئے۔ انہوں نے نشری ڈرامے میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ شوکت تھانوی چونکہ خود ایک چابک دست صناع و اداکار ہیں۔ اس لیے ان کی نشری تمثیل کی اہم خصوصیت کردار نگاری ہے اور ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے نشری دنیا کو کئی مستقل کردار دیے ہیں جو ضرب المثل بن گئے ان میں آل انڈیا ریڈیو کے منشی جی اور ریڈیو پاکستان لاہور کے قاضی جی زندہ جاوید ہیں۔ ان کے نشری ڈراموں کے کئی مجموعے چھپ کر منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان میں ایک مجموعے کا نام ''سنی سنائی'' ہے۔ اس طرح ریڈیو ڈرامہ نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے جن میں راجندر سنگھ بیدی، پروفیسر اشتیاق حسین قریشی، شاہد احمد دہلوی، مجموعہ سحر ہونے تک۔

سید انصار ناصری کے ڈراموں کے مجموعے کا نام وحشی ہے۔ مرزا ادیب نے ریڈیو کے لیے کافی تعداد میں ڈرامے لکھے جن میں چند مشہور ڈرامے یہ ہیں:

آنند کمار، ماں شہنائی، دیوار، بیٹا، بہن، پہاڑ کے دامن میں، فرعون کی محبوبہ وغیرہ

ان کے علاوہ ملک حبیب احمد، حفیظ جاوید، اسلم ملک، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی، محمود نظامی، سلطان حسین، انتظار حسین، یوسف ظفر، مختار صدیقی، عمیق حنفی، رفعت جمالی، کرتار سنگھ دگل، حیات اللہ انصاری، مجاہد علی عابد، محمد حسن، شمیم حنفی، اظہر افسر، فضل حسین، وارث احمد خاں، قمر جمالی، آفاق احمد، رفعت سروش اور اظہار اثر نے ریڈیو ڈرامے لکھے۔ لہٰذا اُردو کے نشری ڈراموں کی ایک خاصی تعداد موجود ہے۔ جسے کسی بھی قیمت پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آج اسٹیج پر سرعام اُردو کے ڈرامے بندی ڈرامے سے منسوب کر کے اسٹیج کیے جا رہے ہیں۔ اس بحرانی دور میں ریڈیو ہی وہ واحد ادارہ ہے جس نے خالص اُردو طبع زاد اور اخذ کیے ہوئے ڈرامے نشر کریں ہیں۔ تاہم ہمارے ناقدین نے اس صنف کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جس کی وجہ سے اس کی قدر و قیمت اور ادبی حیثیت کے تعین میں دشواری آئی ہے۔ ان ڈراموں نے اُردو کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اسٹیج کے ڈرامے تو اسٹیج تک محدود رہے ہیں لیکن نشری ڈرامے کی پہنچ معاشرے کی عمومی سطح تک ہے جس کی وجہ سے نشری ڈراموں نے اُردو ادب کو ڈرامے کے حوالے سے دور دراز علاقوں تک پہنچایا ہے اور زبان کے حوالے سے بھی اہم کام کیا ہے کیونکہ ریڈیو کا ہر پروگرام بولنے والی زبان میں نشر کیا جاتا ہے۔

اُردو:

آل انڈیا ریڈیو کے اوائل دور میں جب مختلف نشریاتی اصناف کی ہیئت کا تجربہ کیا جا رہا تھا

www.taemeernews.com

اس زمانے میں عام لوگوں کی رائے میں ڈرامہ فیچر تھا اور فیچر ڈرامہ۔ اس وقت ریڈیو کے ارباب اقتدار کے سامنے ریڈیو فیچر کا کوئی واضح تصور نہیں تھا اور نہ ہی اس سلسلے میں کوئی عملی قدم اٹھایا گیا۔ فیلڈن اور بخاری نے کچھ فیچر پروڈیوس کیے لیکن وہ لائق ستائش نہیں تھے۔ بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں ریڈیو کی اس صنف کی طرف لوگوں نے توجہ دی۔ تقریباً آل انڈیا ریڈیو کے سبھی مراکز سے مختلف زبانوں میں فیچر نشر کیے جاتے ہیں۔ اُردو زبان میں زیادہ تر فیچر حیدرآباد، سرینگر، بھوپال، دہلی اورنگ آباد اور بیرونی نشریات کی اُردو سروس سے نشر کیے جاتے ہیں مگر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آج بھی آل انڈیا ریڈیو میں روایتی انداز کے فیچر پروڈیوس کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ میں اپنی گفتگو کو مختصر کرتے ہوئے یہاں چند اُردو فیچر کا ذکر کروں گا۔ اگر اُردو سروس میں موجود ادبی فیچر کی ایک مختصر سی فہرست پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس نے بھی اپنے طور سے ادب کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اُردو سروس کے ادبی فیچر کا عنوان آئینہ ہے جسے دو آوازوں میں براڈ کاسٹ کیا جاتا ہے اور اُردو کے مشاہیر نے اس سروس کے لیے بے شمار فیچر لکھے ہیں۔

شیخ محمد ابراہیم ذوق	-	ڈاکٹر تنویر احمد علوی/سلامت اللہ
مرم کوئی نہ جانے	-	ڈاکٹر مظفر حنفی
ہولی اُردو شاعری میں	-	ایضاً
قرۃ العین حیدر	-	ایضاً
اُردو شاعری میں رام کی عظمت	-	ایضاً
حضرت نظام الدین اولیاؒ	-	نثار احمد فاروقی
مرزا مظہر جانِ جاناں	-	پروفیسر محمد حسن
گذشتہ لکھنؤ	-	سعادت علی صدیقی
کارِ جہاں دراز ہے	-	شمیم حنفی
خبرِ تحیرِ عشق من (تصوف)	-	ایضاً
ولی دکنی	-	غلام ربانی تاباں
غالب	-	مرزا محمود بیگ
میر تقی میر	-	ساغر نظامی

www.taemeernews.com

خوب پہچان لو مجاز ہوں میں - آل احمد سرور

سرِ انشا - ڈاکٹر نیر مسعود

یہ فہرست بہت طویل ہے اور لگ بھگ ساٹھ ستر فیچر آج بھی مختلف ادبی موضوعات پر اُردو سروس میں محفوظ ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر مظفر حنفی کی کتاب ریڈیائی تقریر اور فیچر کی خاص اہمیت ہے کہ اس کتاب میں شامل فیچر جو ادبی موضوعات پر ہیں۔ من وعن شائع کیے گئے ہیں۔

اس سلسلے کی دوسری اہم کتاب حضرت آوارہ کے ریڈیائی فیچر کا مجموعہ۔ میرا فرمایا ہوا ہے یہ کتاب سنہ ۱۹۶۰ء میں چھپی تھی حضرت آوارہ، ریڈیو میں اسکرپٹ رائٹر تھے اور بے شمار جھلکیاں انہوں نے لکھیں۔ اس کتاب میں شامل سبھی فیچر مزاحیہ موضوعات پر ہیں۔

آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ریڈیو آج بھی نہایت ایمانداری کے ساتھ اپنے مختلف اصناف جیسے ٹاک، ڈرامہ، فیچر، انٹرویو، کے ذریعہ ادب کو شہروں کی قید سے باہر نکال کر grass root سطح پر اُردو جاننے والوں تک پہنچا رہی ہے جسے غیر نشریاتی ادب نہیں کر سکتی۔ یہاں ضمناً ایک اور بات بتاتا چلوں کہ آج کی تاریخ میں آل انڈیا ریڈیو کی اُردو سروس دنیا میں اُردو نشریات کی سب سے بڑی سروس ہے جو روزانہ اپنے سامعین کے لیے سوا بارہ گھنٹے کا پروگرام نشر کرتی ہے اس کے علاوہ عالمی نشریات کے نیٹ ورک پر بھی اُردو کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ بی بی سی کے علاوہ امریکہ، ایران، روس، جرمنی، چین، جاپان، اٹلی، ترکی، بنگلہ دیش، سعودی عربیہ، کویت جیسے ممالک سے بھی روزانہ اُردو میں پروگرام نشر کیے جا رہے ہیں جس میں مختلف ادبی موضوعات پر پروگرام نشر کیے جاتے ہیں لیکن صد افسوس ہے کہ جس ادارے نے اتنا کچھ اُردو کے فروغ کے لیے کیا ہو اس کی جانب اکادمی اور دوسرے ادبی ادارے خاطر خواہ توجہ نہیں دے رہے ہیں، میں شکر گزار ہوں دلّی سرکار کے اُردو افسر کا جنھوں نے اس موضوع پر مجھے مقالہ پڑھنے کی دعوت دی۔

●●●

www.taemeernews.com

انیس اعظمی

اُردو زبان کے فروغ میں ڈرامے کا کردار

مجھے اِظہارِ خیال کے لیے جو موضوع دیا گیا ہے وہ سننے میں جس قدر آسان ہے، غور و فکر کے بعد اُتنا ہی مشکل اور گنجلک بھی ہے۔ موضوع کی اگر تشریح کی جائے تو موٹے طور پر، ''زبان، فروغ، ڈرامہ اور کردار'' سے مل کر جو شکل اُبھرتی ہے اُسی پر گفتگو کی جانی چاہیے۔ لیکن یہ بھی طے ہے کہ جو بھی گفتگو ہوگی وہ ڈرامے کے حوالے سے ہی ہوگی اور وہ بھی بالخصوص اُردو ڈرامے کے حوالے سے ہی کی جانی چاہیے۔

آزادی کے بعد سے آج تک جب بھی جہاں بھی ہندوستانی ڈرامے کے حوالے سے ڈراما نگاری پر گفتگو ہوئی ہے، یہی ماتم ہمیشہ سنائی دیا ہے کہ ملک کی دیگر زبانوں کے مقابلے اُردو ڈراما نگاری اور بالخصوص طبع زاد اُردو ڈرامے کی صورتِ حال افسوسناک ہے۔ اُردو زبان میں موجود اکثر کامیاب ڈراموں میں اکثریت تراجم یا Adaptations کی ہے۔ میں اُن ڈراموں کی بات بالکل نہیں کرنا چاہوں گا جو صرف پڑھے جانے کے لیے لکھے جاتے ہیں اور جن کے مقدر میں اِسٹیج ہونا لکھا ہی نہ ہو۔ ڈراموں کو لکھنے کا اوّل تا آخر مقصد ہے اُس ڈرامے کا اِسٹیج ہونا اور جب تک وہ اِسٹیج نہیں ہوتا وہ پورا نہیں ہے ادھورا ہے۔

اِنسان اور فن کا کیا رشتہ ہے، یہ رشتہ کتنا پُرانا ہے، غالباً یہ رشتہ کائنات کے عمل میں آنے کے ابتدائی دور سے ہی قربت کا رشتہ رہا ہے۔ انسان جب اِس زمین پر نمودار ہوا ہوگا، اُس نے

www.taemeernews.com

رفتہ رفتہ اپنے مشاہدات کی روشنی میں بغیر کسی سوچے سمجھے منصوبے کے، مہذب ہونے کی کوشش کی ہوگی، اُس نے اپنے لیے سائبان بنایا، اُن مویشیوں کو سادھ کر پالتو بنایا جو اُس کے لیے کارآمد ہو سکتے تھے، کُنبے کو جما کر قبیلے کی شکل دی تا کہ زیادہ محفوظ ہو سکے، فصل اُگائی اور اناج کو جمع کرنا سیکھا، تا کہ وقتِ ضرورت کام آسکے۔ پھر اُس نے اپنے مفاد کو محفوظ رکھتے ہوئے اپنے عقائد طے کیے ہوں گے، پھر اُس نے اپنے ہاتھوں اپنے صنم گڑھے ہوں گے اور پھر اِن سب کاموں سے فارغ ہو کر اُس نے اپنے سکون اور اپنے آپ کو محظوظ کرنے کے لیے فنون کو جنم دیا ہوگا۔ ظاہر ہے یہ تمام کام منصوبہ بند اور سلسلہ وار نہیں ہوئے ہوں گے بلکہ اُن کے درمیان کافی وقفہ حائل ہوا ہوگا۔

آج سے تقریباً لاکھ دو لاکھ برس پہلے جب کسی حساس اِنسان نے تیز گرمی میں بارش کا لُطف لیا ہوگا، یا جب تیز سردی میں دہکتے سورج کی تپش نے اُسے سکون بخشا ہوگا، یا جب پہلی بار دو پتھروں کے ٹکرانے کے عمل سے آگ نکلی ہوگی اور وہ اُس آگ کو اپنے استعمال میں لا کر خوش ہوا ہوگا، یا جب کسی جانور کا شکار کرتے وقت اُس کی نگاہ اُس جانور کے معصوم دودھ پیتے بچے پر پڑی ہوگی جس کی آنکھوں میں اُس نے بے بسی اور بے کسی کو پہلی بار محسوس کیا ہوگا اور اپنے وار کو قصداً پہلی بار خالی جانے دیا ہوگا۔ جب پہلی بار اُسے دریا کی موجوں میں موسیقی سنائی دی ہوگی اور جب اُس نے سمندر سے سُرخ اور حسین سورج کو اُگتے ہوئے دیکھا ہوگا اور اُسے چھو لینے کی خواہش نے اُس کے وجود کو بے چین کیا ہوگا تو یقیناً اُسے مسرت ہوئی ہوگی اور اُس نے غیر شعوری طور پر فنون کو جنم دیا ہوگا۔

اِس بات کو محسوس کیا جا سکتا ہے کہ اب سے لاکھ دو لاکھ برس پہلے جب انسان اتنا مہذب ہو چکا تھا کہ قبیلے کی صورت میں اپنے جیسوں کے درمیان رہنے لگا تھا اور اُس کا پورا قبیلہ شام کو شکار کا بھنا ہوا گوشت الاؤ کے چاروں طرف گول دائرے میں بیٹھ کر کھانے کے بعد خوشی کا اظہار اُچھل اُچھل کر یا بندروں کی نقالی کرتے ہوئے کود پھاند کر کے کرتا ہوگا۔ اُس وقت مسرت یا غم کے اظہار کے واسطے اُس کے پاس لفظ نہیں تھے، زبان نہیں تھی ہاں چند مخصوص آوازیں یقیناً تھیں اور جسم کی حرکات سے وہ ایسا کچھ ضرور کر لیتا ہوگا جسے دوسرے، سمجھ جاتے ہوں گے۔ اِسی معاشرے میں کسی ایک دن کوئی ایسا حیرت انگیز واقعہ کسی حساس کے ساتھ یقیناً پیش آیا ہوگا کہ اس نے اس واقعہ سے سب کو باخبر کرنا بے حد ضروری سمجھا ہوگا اور اس حساس انسان کے اپنے ہاؤ

www.taemeernews.com

بھاؤ، اپنے جسم کی حرکات اور اپنی مخصوص آوازوں کی مدد سے اور اداکاری کے حوالے سے وہ واقعہ بیان کیا ہوگا۔ وہ انسان کون تھا، ہم نہیں جانتے لیکن وہ جو بھی تھا، وہ دنیا کا سب سے پہلا فنکار تھا، وہی پہلا اداکار تھا اور یقیناً وہی پہلا ڈرامہ نگار تھا۔

ڈراما ادب کی بے حد دلچسپ صنف ہے۔ مقاصد کے نظریے سے وہ سماجی ہے اور انسانی شعور کی گہرائیوں میں غوطہ لگا کر جذبات کو بیدار کرتا ہے۔ ترقی یافتہ قوموں میں اِسے بے پناہ مقبولیت حاصل ہے۔ موٹے طور پر ڈرامے کے دو پہلو ہیں ایک ادبی اور دوسرا تمثیلی اور یہ دونوں پہلوؤں سے گزر کر ہی مکمل ہوتا ہے یعنی ڈراما جب تک اِسٹیج نہیں ہوتا تب تک مکمل نہیں مانا جاسکتا اور اسٹیج ہوئے بغیر اُس کی خوبیاں خامیاں بھی واضح نہیں ہو پاتیں اور نہ ہی اس کے لکھنے کا مقصد پورا ہو پاتا ہے۔ یہ بات بالکل ویسی ہی ہے جیسے چڑیا کا انڈا دینا ایک عمل ہے اور اس انڈے کا چڑیا بننا دوسرا عمل ہے۔ ڈرامے کا لکھا جانا دراصل صرف انڈے کا وجود میں آنا ہے اور اُس کا اسٹیج پر پیش کیا جانا اس کا مکمل ہونا اور اس کے چڑیا بننے کا عمل ہے۔

ڈراما کیا بلا ہے کس زبان کا لفظ ہے؟ کس حوالے سے ہم تک آیا ہے، ہم نے کن معنوں میں اسے اپنایا ہے، ہم کب، کہاں اور کیسے اسے برتتے ہیں اور کیسے کیسے معانی اور مفہوم پیش کرتے ہیں۔ یہ سوال بھی جانے کب سے اپنی حق تلفی کے سبب چاہتے ہیں جواب طلبی۔

کیا ڈراما ادب کا حصہ ہے، کیا ادیبوں، دانشوروں نے اُسے کبھی گردانا ہے؟ کیا ڈرامے کی زبان، ادبی زبان ہوتی ہے؟ کیا ادب سے وابستہ اور ادبی زبان کو ترجیح دینے والے ڈراما نگاروں کے ڈرامے عملی طور پر کامیاب رہے، یا پھر وہ ڈراما نگار جن کے پاس ادب کا وسیع مطالعہ تو تھا، مشاہدہ بھی کم نہ تھا، لیکن وہ کشادہ ذہن تھے اور ہٹ دھرمی بھی نہیں تھے اور اُن میں لچک بھی تھی۔ ایسے ہی ڈراما نگاروں نے بنایا یہ اُصول کہ آئندہ زمانے میں کیا ہوگا قابلِ قبول! اب تک کون ہوا ہے کامیاب؟ ایمانداری سے نہیں دیا گیا اس کا جواب۔

اُردو ڈرامے کی پوری تاریخ کو اگر بہت زیادہ غور سے نہ بھی دیکھیں اور اُس کے جملہ ڈراما نگاروں پر محض سرسری سی نگاہ ڈالیں تو بھی ایک بہت واضح سی لکیر کھنچی دکھائی دیتی ہے۔ جو چھپائے نہیں چھپتی۔ اِس لکیر کے ایک جانب ایک پالے میں وہ ڈراما نگار ہیں جن کا تعلق درس و تدریس سے رہا ہے یعنی خالص ادبی! اور لکیر کے دوسری سمت والے پالے میں وہ ڈراما نگار ملیں گے جن کا تعلق تھیٹر سے رہا ہے۔ یعنی وہ جو ڈرامہ کرنے پر یا تھیٹر سے جڑے ہونے پر شرمندگی

www.taemeernews.com

محسوس نہیں کرتے۔ کہنے کو دونوں مسلمان، لیکن اُن کی مسجدیں جدا، اُن کے عقیدے جدا، یہ دونوں مسلمان ایک دوسرے سے بدگمان، حقیقت یہ ہے کہ اگر اُردو ادب میں ڈرامے کا وقار، باوقار نہیں بن سکا ہے تو اِس کا سبب بھی یہی ہے۔

اُردو ڈرامے کے حوالے سے یہ بھی ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ اُردو معاشرے میں نہ صرف ڈرامے کو بلکہ عوامی سلسلے سے جڑی جملہ اصناف کو احترام تو چھوڑیے، وہ مقام بھی نہیں ملا جو اُنہیں دوسری ہندوستانی زبانوں میں میسر آیا۔ ہم اُردو والوں کی تنگ نظری کا عالم یہ ہے کہ ڈرامے کے اداکاروں کو سدا نچنیا کہا، ڈرامے کو حقارت سے دیکھا جس کی وجہ سے لوک روایت کے حسین پیکر جن کے عناصر نے مستقبل میں ڈراما کی شکل اختیار کی، دوسری زبانوں کے مقابلے اُردو والوں میں نہیں پنپ سکی۔

ہماری اِنہیں غلطیوں کی وجہ سے آج کبیر اُردو کا نہیں ہندی کا عظیم شاعر ہے، امیر خسرو بھی کسی حد تک ہندی والوں کے قبضے میں جا چکے ہیں، آغا حشر کاشمیری کے تمام اُردو ڈرامے گزشتہ ایک دہائی سے ہندی ڈراما گروپس کی جانب سے ہی اسٹیج کیے جا رہے ہیں اور وہ اسے ہندی ڈراما کہنے لگے ہیں۔ امانت لکھنوی کا اِندر سبھا کسی اُردو والے نے کب اسٹیج کیا کسے یاد ہوگا لیکن ہندی والوں نے گزشتہ دس برسوں میں اِس ڈرامے کو صرف دلّی میں ہی چار بار اسٹیج کیا اور آخری بار اب سے کوئی چار برس پہلے ہندی ڈراما کہہ کر اسٹیج کیا گیا اور اس بات پر احتجاج اِس لیے نہیں ہو سکا کہ کوئی اُردو والا جب تھیٹر میں بھٹکتا ہی نہیں تو بولے گا کون؟

آج اُردو ڈرامے کے منظرنامے پر گفتگو کرتے ہوئے ہمارے اساتذہ رٹی رٹائی ایک ہی بات کی گردان کرتے ہیں۔ وہ ڈرامے کی تاریخ بیان کرتے وقت امانت کے اِندر سبھا کے بعد سیدھے آغا حشر کاشمیری کے چند ڈراموں کا ذکر کرتے ہوئے امتیاز علی تاج کے انارکلی پر آتے ہیں اور وہاں سے حبیب تنویر کے آگرہ بازار کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر محمد حسن کے ضحاک پر دم توڑ دیتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ اس کے علاوہ اُن کے پاس اور کہنے کو کچھ نہیں ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اساتذہ میں شاید ہی کوئی ہو جس نے اِندر سبھا کو یا انارکلی کو یا پھر ضحاک کو کبھی اسٹیج پر دیکھا ہو۔ یہ وہ بدنصیب ڈرامے ہیں جو کورس میں شامل ہیں اور اسٹیج سے خارج۔

اُردو ادب میں ایسے ڈراموں کی کمی نہیں جن میں وہ تمام لوازمات ہوتے ہیں جو کہ ہونے ضروری ہیں مثلاً اُن ڈراموں کا پلاٹ ہوتا ہے، کہانی ہوتی ہے، اُن کی نثر بھی خوب ہوتی ہے اور

www.taemeernews.com

مکالموں کی مدد سے وہ یقیناً ڈرامے کے فارم میں بھی ہوتے ہیں لیکن ہاں اُن میں ڈرامائیت ندارد ہوتی ہے۔ اِن ڈراموں کا جسم مکمل ہوتا ہے بس کمی ہوتی ہے تو روح کی اور ایسے بیشتر ڈراموں کے خالق ہمارے اساتذہ ہیں۔

نیشنل اسکول آف ڈراما کے بانی ہدایت کار اور جدید ہندوستانی تھیٹر کے روحِ رواں و معمار ابراہیم القاضی نے برسوں یہ کوشش کی کہ اُردو میں خوبصورت ڈرامے لکھوا کر اُنہیں قومی سطح پر اسٹیج کیا جائے۔ تجربات کی روشنی میں اُنہیں بہت جلد یہ یقین ہوگیا کہ اُردو والے دوسری اصناف میں چاہے کتنا بھی کمال رکھتے ہوں اچھے ڈرامے تخلیق کرنے سے قاصر ہیں۔ لہٰذا انہوں نے اُردو والوں سے وہ کام لیا جس کے وہ مستحق تھے یعنی دنیا کے خوبصورت ڈراموں کے اُردو میں خوبصورت تراجم کروائے اور پھر اُردو زبان میں تمامتر لوازمات کے ساتھ خوبصورت ڈراموں کو اسٹیج کرنے کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔N.S.D نے بے شمار اُردو ڈراموں کو اتنی بار اسٹیج کیا ہے کہ اُردو معاشرے کو یقیناً ان کا احسان مند ہونا چاہیے ان میں اکثریت تراجم کی ہے جن میں سے چند کے نام ہیں: تغلق، چیری کا باغ، رضیہ سلطانہ، ایڈیپی، اندر سبھا، برجیس قدر کا کنبہ، گڑیا گھر، کنگ لیئر، کنجوس، ٹرائے کی عورتیں، اینٹی گنی، اوتھیلو، تین پیسے کا تماشہ، معاوضے، قتل کی حوس، دانتوں کی موت، سرائے کی مالکن، بیویوں کا مدرسہ، دوسرا آدمی، موت کے سائے، زنانے دانت کا اسپتال، بیگم کا تکیہ، جنتا کا دشمن، غازی پور کا حجام، بال بال بچے، چھوٹے سیّد بڑے سیّد، آفتاب فیض آبادی، مشرقی ہور، یہودی کی لڑکی، آزر کا خواب، پناہ گاہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ، قیدِ حیات، کرماوالی، دن کے اندھیرے، پرندوں کی محفل، عزیز النساء اُمراؤ جان ادا، حبیب ماموں، مٹی کا گھیرا اور دشمن وغیرہ۔

اُردو زبان کے وہ ڈرامے جنہوں نے بے حد کامیابی سے ناظرین کے ذہنوں میں اپنی جگہ بنائی اور جن کے ذکر کے بغیر اُردو ڈرامے کا سرمایہ خالی کہلائے گا۔ اُن کے نام ہیں:

۱۔ سریندر گلاٹی کے ڈرامے: شاباش انارکلی، ٹیپو سلطان، اورنگ زیب

۲۔ گریش کرناڈ کا تغلق

۳۔ حبیب تنویر کے ڈرامے: آگرہ بازار، میرے بعد، شطرنج کے کھلاڑی، دیکھ رہے ہیں نین

۴۔ سریندر ورما کے ڈرامے: چھوٹے سیّد بڑے سیّد اور قید حیات

۵۔ اصغر وجاہت کے ڈرامے: جس لہور نئی ویکھیا اور اناکی آواز

www.taemeernews.com

۶۔ شیلا بھاٹیہ کا درد آئے گا دبے پاؤں
۷۔ ایس.ایم.مہندی کا غالب کون ہے؟
۸۔ جاوید صدیقی کا تمہاری امرتا
۹۔ بھیشم ساہنی کے ڈرامے: ہانوش معاوضے اور کبیرا کھڑا بجار میں
۱۰۔ شاہد انور کا: غیر ضروری لوگ۔

گزشتہ چار دہائیوں میں اُردو میں اتنی بڑی تعداد میں طبع زاد ڈرامے نہیں لکھے گئے جتنی بڑی تعداد میں خوبصورت اور کامیاب تراجم یا (اڈاپٹیشن Adaptations) اُردو میں ہوئے ہیں۔اس میدان میں نمایاں خدمات کے لیے قابلِ ذکر نام ہیں: قدسیہ زیدی، مجنوں گورکھپوری، عتیق احمد صدیقی، سجاد ظہیر، رضیہ سجاد، قادر علی بیگ، حضرت آوارہ، حبیب تنویر، سریندر گلاٹی، منیب الرحمٰن، جے.این.کوشل، بلراج پنڈت، وصی خان، انور عظیم، نیاز حیدر، رنبیر سنگھ، شاہد انور، فضل تابش، زاہدہ زیدی، رنجیت کپور، نادرہ ببر، شمع زیدی، کیفی اعظمی اور صفدر ہاشمی سے ہوتی ہوئی اس خاکسار تک ایک طویل فہرست ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ چند ڈراموں کی بنا پر اُردو ڈراما اپنا کوئی خاص مقام نہیں بنا سکا اگر ہم بندی، مراٹھی، کنڑ اور بنگلہ زبانوں میں لکھے گئے طبع زاد اور بے پناہ کامیابی سے اسٹیج کیے گئے معیاری ڈراموں کی فہرست بنائیں تو ہم محسوس کریں گے کہ ان کے مقابلے اُردو ڈراما نہ صرف محدود ہے بلکہ ان سے خاصہ پیچھے بھی نظر آتا ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اُردو کے موجودہ ڈراما نگار جن میں سے بیشتر یونیورسٹیوں کے شعبۂ اُردو سے تعلق رکھتے ہیں اور جو نقاد، محقق اور شاعر کی حیثیت سے بھی اپنی شناخت بنا چکے ہیں انہوں نے دوسری تصنیفات کی طرح ڈراما بھی اپنی اسٹڈی میں ہی بیٹھ کر لکھ مارا۔انہوں نے تھیٹر جانے، اسے محسوس کرنے اور اس کے جدید تقاضوں کو جاننے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی یہی وجہ ہے کہ ان کے ڈرامے یقیناً ڈرامے تو ہیں لیکن ایسے جن میں وہ سب ہے جو ڈرامے میں ہونا چاہیے ہاں صرف روح ہی ندارد ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ان میں سے کسی کا کوئی ڈراما کبھی کہیں کسی پروفیشنل ڈائریکٹر نے آج تک اسٹیج نہیں کیا اور بیچارہ وہ ڈراما رسائل میں دفن ہو کر رہ گیا۔

اُردو ڈرامے کے فروغ کے لیے جو سب سے ضروری چیز ہے اور جس کا ہونا لازمی ہے وہی

www.taemeernews.com

شے اُردو والوں کے پاس ناپید ہے۔ ڈرامے کے لیے ڈراما نگار کا ہونا جتنا ضروری ہے اتنا ہی ہدایت کار کا اور اتنا ہی اداکاروں کا ہونا بھی ضروری ہے۔ لیکن اگر یہ سب ہوں تو ان کے بعد سب سے اہم اور بے حد ضروری موجودگی ہوتی ہے ناظرین کی۔ گزشتہ ۲۵ برسوں میں اسٹیج ہونے والے بے شمار اُردو ڈراموں کے پورے منظرنامے کو نگاہوں میں رکھ کر مجھے یہ کہتے ہوئے قطعاً شرم نہیں آتی کہ اُردو کے بے پناہ اور شاندار ڈراموں کو دیکھنے والوں میں اُردو والے کبھی بھی ایک فیصد سے زیادہ نہیں دکھائی دیے۔ ڈراما چاہے اندر سبھا ہو، بیگم کا تکیہ ہو، یہودی کی لڑکی ہو، آزر کا خواب ہو برجیس قدر کا کنبہ ہو، معاوضے ہو، چھوٹے سیّد بڑے سیّد ہو، ٹیپو سلطان ہو، اورنگ زیب ہو، شاباش انارکلی ہو، قیدِ حیات ہو، درد آئے گا دبے پاؤں ہو، تغلق ہو یا ایک رُکا ہوا فیصلہ ہو۔ ان ڈراموں کے ٹکٹ آسانی سے نہیں ملتے اور اُردو والے دو دن پہلے ایڈوانس ٹکٹ لینے کی زحمت کیوں کرتے بھلا۔

آج بھی تقریباً ہر مہینے انڈیا ہیبیٹیٹ سینٹر میں معقول اُردو ڈرامے ہوتے ہیں لیکن ناظرین کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے اُردو والوں کے لیے یہاں آنے پر باقاعدہ ممانعت ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آزادی کے بعد لکھے گئے اُردو کے بہترین ڈراموں کے خالق عموماً وہ ڈراما نگار ہیں جو نہ تو اُردو دنیا میں کسی ستون کے طور پر جانے جاتے ہیں اور نہ ہی اُردو رسائل کے مدیران کو ان کی تخلیقات کا انتظار ہے لیکن یہ ڈراما نگار تھیٹر سے رشتہ قائم رکھے ہوئے ہیں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ گذشتہ دس پندرہ برسوں میں میڈیا میں جو نئے تخلیق کار سامنے آئے ہیں ان میں سے اکثریت ان کی ہے جنہوں نے انگلش میڈیم میں تعلیم پائی ہے اور وہ مسلسل ٹی-وی سیریل اور ڈرامے لکھ رہے ہیں یہ نئی نسل کے نئے تخلیق کار جو زبان لکھ رہے ہیں وہ قصداً یا اتفاقاً اُردو سے اتنا قریب ہے کہ اُسے آپ اگر اُردو نہیں مانیں گے تو یقیناً ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اُردو ڈراموں پر مضامین یا تبصروں کے لیے اُردو کے رسائل یا جریدے بالکل سنجیدہ نہیں ہیں اس حوالے سے ''ذہنِ جدید'' کے علاوہ کوئی دوسرا جریدہ قابلِ ذکر نہیں ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اُردو کے وہ ڈرامے جو اسٹیج کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہیں اور بہت خوب بھی ہیں وہ شائع نہیں ہو سکے ہیں۔ اگر وہ دستیاب ہو جائیں تو ایک بڑی کمی پوری

www.taemeernews.com

ہوجائے گی۔ ابھی اُردو کے جن کامیاب ڈراموں کے نام لیے گئے تھے افسوس کہ ان کی اسکرپٹ بازار میں یا کتب خانوں میں دستیاب نہیں ہے۔

اُردو کے بہت سے نامور ادیبوں نے بہت سے اچھے ڈرامے لکھے یا اڈپٹیشن کیے افسوس کہ وہ سرمایہ بھی Ready-Reference کے طور پر ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔

۱۔ ابراہیم جلیس کا: اُجالے سے پہلے

۲۔ احمد ندیم قاسمی کا: داراشکوہ

۳۔ اختر حسین رائے پوری کا: شکنتلا

۴۔ اختر شیرانی کا: ضحاک

۵۔ اطہر پرویز کا: بیداری

۶۔ پطرس بخاری کا: گونگی جورو یا سیب کا درخت

۷۔ خواجہ احمد عباس کا: زبیدہ

۸۔ سجاد ظہیر کا: بیمار

۹۔ شاہد احمد دہلوی کا: اندھی

۱۰۔ عصمت چغتائی کا: دھانی باکیں، جیسے ڈراموں کی ایک طویل فہرست ہے جنہیں کوئی بھی سرکاری ایجنسی شائع کرواسکتی ہے جو یقیناً اُردو ڈرامے کے سرمائے میں اضافہ ہوگا۔

آخر میں اپنی بات ختم کرتے ہوئے میں صرف اتنا کہوں گا کہ جب اُردو معاشرہ، اُردو ڈراموں کے فروغ میں سنجیدہ نہیں رہا تو پھر اُردو زبان کے فروغ میں ڈرامے کے کردار پر زبردستی کی پیروی کیسے ممکن ہوسکتی ہے۔

●●●

www.taemeernews.com

ڈاکٹر مشتاق صدف

اردو زبان، تشکیلی عناصر اور سماجی سروکار

ہر زبان کی طرح اردو زبان کا بھی سماج سے گہرا رشتہ اور ربط رہا ہے کیونکہ دوسری زبانوں کی مانند سماجی ضروریات نے ہی اردو زبان کو بھی جنم دیا۔ یہ کوئی ڈھنڈورا پیٹنے والی بات نہیں ہے بلکہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ فارسی، انگریزی، ہندی غرض یہ کہ تمام زبانوں کی پیدائش اور نشوونما کو معاشرتی، اقتصادی، سیاسی، تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی حالات نے حد درجہ متاثر کیا۔ اسی طرح اردو زبان کی پیدائش، نشوونما، ترویج واشاعت پر بھی معاشرہ نے بے حد اثر ڈالا۔ اسے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے ہزار سالہ دور کی تاریخ میں زبانوں کے بننے، پھلنے پھولنے، سنورنے اور نکھرنے میں سماج کا ہی سب سے اہم رول رہا ہے۔ اردو زبان بھی انہی میں شامل ہے۔ لیکن یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ سماجی ضرورتوں نے تو زبانوں کو پیدا کیا لیکن سماج نے زبانوں کی نشوونما اور ارتقائی عمل پر یکساں طور پر اثر نہیں ڈالا۔ ہندوستانی معاشرہ نے اپنی تاریخ میں عروج وزوال اور تغیر کے نہ جانے کتنے ادوار دیکھے ہیں اور ہر دور میں زبانوں پر سماج کا زبردست اثر پڑا ہے۔ اردو زبان بھی اس سے الگ نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مختلف ادوار کا اثر کسی زبان پر مختلف انداز میں مرتب ہوتا ہے۔ اور اسی لیے سماجی وثقافتی صورت حال نے کسی زبان یا بولی کو خوب پروان چڑھایا تو کسی کی رفتار میں بالکل بریک لگا دیا۔ اس کی زندہ مثال ہندوستان میں فارسی اور سنسکرت زبان ہے۔ سماج اور سماجی ضرورتوں نے انگریزی، ہندی اور اردو کو آگے

www.taemeernews.com

بڑھایا تو فارسی اور سنسکرت کے دائرہ کو انتہائی محدود کر دیا اور اب اردو کے حالات ناگفتہ بہ ہیں۔ اردو سماج کا اس سے بڑا المیہ کیا ہوگا کہ اردو کے زیادہ تر پروفیسروں کی اولادیں بھی اردو سے نا آشنا اور نابلد ہیں۔ آج سماج کی ضرورتیں فیشن میں تبدیل ہوتی جارہی ہیں۔ اس لیے زبان کی فیشن زدگی بھی ہو رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی اور اردو کی جگہ انگریزی کو فوقیت دی جارہی ہے۔ ظاہر ہے جدید ہندوستان کے اس لسانی منظر نامہ میں نقصان انہی دو زبانوں کا ہوگا۔ سماج کا رشتہ جب کسی زبان سے ٹوٹنے لگتا ہے تو اس کی مقبولیت میں کمی واقع ہونے لگتی ہے۔ اردو زبان جس کا سماج سے رشتہ ہندوستان کے ہزار سالہ دور میں ہمیشہ گہرا رہا ہے آج اس میں تیزی سے کمی آرہی ہے۔ جو زبان ہندوستان کی دوسری جدید زبانوں کو بھی فروغ دینے میں بنیادی سطح پر معاون ثابت ہوئی آج اس کی جڑوں کو وہی زبانیں کاٹ رہی ہیں۔

خیر جو بھی ہو آیئے اب اردو زبان کے تاریخی و سماجی رشتہ کو ذرا ٹٹولیں۔ ممکن ہے اس کا عکس حال پر پڑے تو کچھ کام بنے۔

پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

> ''اردو ادب کی تاریخ اردو زبان کی تاریخ سے شروع ہوتی ہے۔ ہر زبان کی طرح اردو کو بھی سماجی ضروریات نے جنم دیا جس میں آہستہ آہستہ تہذیبی خیالات اور ادبی تخلیقات کے لیے جگہ بنتی گئی۔ اردو کو تاریخ نے جنم دیا ہے، اس کی نشو ونما کے لیے ماحول پیدا کیا اور ایک ایسے معیار پر پہنچا دیا کہ اٹھارہویں انیسویں صدی میں متعدد ملکی اور غیر ملکی علما نے ''ہندوستانی'' کی شکل میں اسے ملک کی محور زبان کا لقب عطا کیا۔ اس کہانی کو سمیٹنے اور اس کی کڑیوں کو جوڑنے کے لیے ہزاروں سال پیچھے جانا ضروری ہے۔'' (اردو ادب کی تنقیدی تاریخ صفحہ ۷)

پروفیسر احتشام حسین کی سوچ اور فکر اردو زبان کے سماجی رشتے کو مستحکم کرتی ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جب کبھی بھی ملک میں مذہبی اور سیاسی سطح پر کوئی بڑی تحریک چھیڑی گئی تو عوامی زبانوں پر بھی اس کا اثر پڑا اور زبانوں میں تغیر و تبدل ہوا۔ مثلاً ہندوستان میں پہلے دراوڑ زبان اور تہذیب و ثقافت کا خوب بول بالا تھا لیکن آریائی زبانوں کی مقبولیت سے دراوڑ زبان کی مقبولیت ماند پڑ گئی۔ شمالی اور وسطی ہند میں آریوں کی زبان پوری طرح چھا گئی اور یہ اثر سماج

www.taemeernews.com

کی بدولت ہوا۔ اس طرح موہن جوداڑو اور ہڑپا کی تہذیب کے ساتھ اس کی زبان بھی معدوم ہوگئی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیوں دراوڑ زبان نے آریائی زبان کو متاثر نہیں کیا اور آریائی زبان کیوں دراوڑ زبان پر سبقت لے گئی؟ ماہر لسانیات یہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ آریہ قوم ایک نئی زبان لے کر ہندوستان آئی تھی اور اس قوم نے اپنی تہذیب، ثقافت اور تمدن کو خوب فروغ دیا تا کہ ان کا نصب العین پورا ہو سکے۔ یہ ان کے مقصد کا حصول ہی تھا کہ ہندوستانی سماج میں اعلیٰ اور ادنیٰ طبقہ کی زبان اور بولی میں زبردست خلا پیدا ہوگیا۔ ایک طرف سنسکرت قواعد، تلفظ، املا کے اعتبار سے دولت مند ہوتی چلی گئی جبکہ پراکرت بولنے والوں کا سنسکرت سے فاصلہ بڑھتا چلا گیا۔ ان دونوں زبانوں میں مذہبی اعتبار سے جو دوری پیدا ہوئی اس سے سب سے زیادہ نقصان سنسکرت کا ہی ہوا۔ کیونکہ سنسکرت دانشوروں اور تعلیم یافتہ افراد تک محدود ہو کر رہ گئی اور عام بول چال کی زبان نہیں بن سکی۔ جبکہ پراکرت کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ سنسکرت بدھ اور جین متوں کی آمد سے متاثر ہوئی۔ مذہبی تغیرات کے سبب ہی سنسکرت کو خسارہ برداشت کرنا پڑا۔ لیکن یہ خسارہ ایک دم سے نہیں ہوا۔ پراکرت کی نشو ونما اور ارتقا میں ویدک دھرم نے بھی نمایاں رول ادا کیا کیوں کہ گوتم بدھ نے اپنے اعلیٰ درجہ کے شاگردوں کو عام لوگوں کی بولیوں میں ہی اپنی ترسیلی و تبلیغی ضرورتیں پوری کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ گوتم بدھ کی اس سوچ سے پراکرتوں کا عروج ہوا۔ دراصل ہندوستان میں لسانی سطح پر 600 ق م میں یہ تیسرا بڑا تغیر تھا۔

یہ عہد پالی، ماگدھی، اردھ ماگدھی، شورسینی جیسی زبانوں کے وجود میں آنے کا بھی ہے۔ اسی درمیان آریائی زبانوں اور پراکرت میں نمایاں تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں۔ پراکرتوں میں سنسکرت تت سم کم اور تدبھو الفاظ کا استعمال زیادہ کیا جانے لگا۔ یہی دور اپ بھرنشوں کا کہلایا جس میں بگڑی زبانیں چودھویں صدی تک عروج پر رہیں۔ لیکن 1000 کے آس پاس ملک کی جدید زبانوں کی ترقی کا دور شروع ہو چکا تھا، کیونکہ اس عہد میں عرب مسلمان ایک بڑی تعداد میں ہندوستان آئے اور اپنی تہذیب وثقافت کے نقوش مرتسم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اسی لیے عرب مسلمانوں کو دسویں صدی کے اواخر تک ہندوستان میں تاریخی اور سماجی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی لسانی تبدیلیوں میں تیزی آئی اور ان کی بولیوں نے یہاں کی بولیوں پر اپنا اثر ڈالنا شروع کر دیا اور اسے تقویت

www.taemeernews.com

ہندوستان کی اس وقت کی سماجی زندگی سے ملی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے قبل سماجی زندگی میں جو ٹھہراؤ آ گیا تھا اس میں نئی جان پڑی لیکن یہ جان اس وقت پڑی جب ایران سے مسلمان یہاں آئے۔ عرب تاجروں کی جنوبی ہند میں مالا بار اور آٹھویں صدی کے آغاز میں سندھ آمد سے ہندوستان کے لسانی منظرنامہ میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ایرانی مسلمانوں کی اکثریت کی بول چال کی زبان فارسی تھی اور اس زمانے میں یہ زبان ہی بااثر سمجھی جاتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مختلف تہذیبوں کے امتزاج سے ہندوستان کی نئی زبانیں پروان چڑھ رہی تھیں۔ ہرش وردھن کی حکومت کے بعد کی صورت حال، محمد غوری کی سلطنت اور پھر خلجیوں کی کشورکشائی، محمد تغلق کے پایۂ تخت کی جنوبی ہند (دیوگری) میں منتقلی، پھر بعد میں دلّی لوٹنے کا عمل، سولہویں صدی میں مغلوں کی آمد، اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کا دور اقتدار، مغلوں کا زوال، مراٹھوں، سکھوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا عروج اور سیاسی اتار چڑھاؤ کے دوران مختلف تہذیبوں کے لسانی ارتباط نے اردو زبان و ادب کو جنم دیا اور غزنوی شہنشاہوں کے پونے دو سو برسوں کی سلطنت میں تہذیبوں کا زبردست میل جول ہوا۔ بازاروں میں تہذیبی لین دین سے ایک دوسرے کی زبانوں کو قبول کرنے اور باہم تاثر پذیری کا بھرپور موقع ملا۔ اسی درمیان محمود غزنوی کی علم دوستی اور البیرونی کی سماجی مسائل سے دلچسپی و لگاؤ نے لسانی منظرنامہ میں اہم کردار ادا کیا۔ اور جب دلّی میں مسلمانوں کی سلطنت قائم ہوئی تو باہمی ارتباط، میل جول اور اتحاد کی ضرورت بڑھتی چلی گئی۔ ایک دوسرے کی رسم و رواج کو اپنانے کا جذبہ بھی پیدا ہوا۔ باہر سے آئے مسلمان بادشاہوں نے ہندوستانی زندگی کو گلے سے لگایا۔ یہاں کی تہذیب و ثقافت کو متاثر کیا اور خود بھی متاثر ہوئے۔ اس طرح تہذیب و ثقافت، رسم و رواج سے لے کر لسانی اعتبار سے بھی لوگوں میں کافی لین دین ہوا۔ جنگ و جدل کا میدان ٹھنڈا ہوا تو محبت کے سوتے پھوٹ پڑے اور ہندوؤں و مسلمانوں کے اندر ایک قومی جذبہ پیدا ہوا ساتھ ہی تصوف کو فروغ ملا۔ امیر خسرو، بندہ نواز گیسودراز اور دیگر صوفیوں نے ہندوستانی بولیوں میں تصوف اور محبت، ایثار و قربانی اور فرض شناسی کا درس دیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپسی میل جول کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ایک طرف جہاں مسلمانوں نے برج بھاشا اور اودھی میں اپنی تخلیقات پیش کیں وہیں دوسری طرف ہندوؤں نے بھی قطبن، جائسی، رس کھان اور رحیم پر لکھا اور انہیں تلسی داس، سورا اور میرا کا مقام دیا اور یہ سب سماجی تبدیلیوں اور ان سماجی تبدیلیوں کو ہمہ

www.taemeernews.com

گیر بنانے والی قوتوں کے سبب ہی ممکن ہوا۔

اردو کی پیدائش اور ارتقا پر ماہرین لسانیات کے متضاد نظریے ہیں۔ سلیمان ندوی اردو کا ارتقاء سندھی میں تلاش کرتے ہیں۔ سہیل بخاری دراوڑ زبان سے اردو کو منسلک کرتے ہیں۔ شوکت سبزواری نے اس کا رشتہ پالی سے جوڑا، کسی نے کہا کہ اردو جنوبی ہند میں پیدا ہوئی، کسی نے اسے پنجاب اور برج بھاشا سے نکلی ہوئی زبان قرار دیا، کسی نے اردو کو کھڑی بولی کا دوسرا نام دیا۔ ان نظریات میں اختلافات ہیں اور اس پر بہت کچھ لکھا بھی جا چکا ہے۔ اس پر بحث بھی ہوتی رہی ہے۔ ہمیں اس کی تفصیل سے یہاں کوئی غرض بھی نہیں لیکن اس ضمن میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اردو چاہے جہاں بھی پیدا ہوئی، جس زبان سے بھی نکلی، جس لسانی ماحول میں بھی ارتقا پذیر ہوئی وہ ایک الگ مسئلہ ہے لیکن اس پر سب اتفاق رکھتے ہیں کہ اردو کو سماجی ضرورتوں نے ہی جنم دیا اور ان کے عطا کردہ ماحول میں ہی یہ مزید پھلی پھولی۔

فارسی، عربی اور سنسکرت کے الفاظ اردو میں کثرت سے ملتے ہیں اور یہ زندہ زبان ہونے کا ایک ثبوت بھی ہے۔ اگر ہم امیر خسرو کی تخلیقات پر نگاہ ڈالیں تو ان میں ہندوستان کی بولیوں، تہواروں، موسموں، پھولوں اور پھلوں کا خوب ذکر ملتا ہے ان میں ہندوستان کی اس وقت کی آب و ہوا اور خوبصورتی کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ عوامی زبان میں ان کی نظمیں، دوہے، پہیلیاں اور کہانیاں ایک الگ ہی تاثر پیدا کرتی ہیں۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپسی ربط وضبط سے ایک طرف نئی آریائی زبانیں متاثر ہو رہی تھیں تو دوسری طرف راجستھانی، بندیلی، برج اور اودھی وغیرہ بھی ارتقا پذیر تھیں اور تیسری جانب اردو بھی ہندوستان کی سرزمین اور سماج میں تیزی کے ساتھ اپنی جگہ بنا رہی تھی۔ جو فوجی یا لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے تھے اور جو فارسی اور سنسکرت سے ناواقف تھے انہیں ایک ایسی زبان چاہیے تھی جو ان کے لیے رابطے کا بھی کام کرے اور جن کا خمیر ان کے آس پاس کی زبانوں یا بولیوں سے تیار ہوا ہو اور ایسی زبان اس وقت کھڑی بولی کی شکل میں اردو ہی تھی۔ اس لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کے رابطِ باہم سے اس زبان کا خوب فروغ ہوا۔ مسلمان بادشاہوں نے بھی اسے قبول کرنے میں کسی پس و پیش سے کام نہیں لیا۔ اس لیے کہ یہ ان کی درباری ضرورتوں اور امورِ حکمرانی کی ادائیگی میں معاون ثابت ہو رہی تھی اور اس ماحول میں اردو ہی سب کے لیے قابل قبول زبان بن سکتی تھی۔ جنوبی ہند میں اردو زبان نہ صرف بلکہ عوام کی زندگی

www.taemeernews.com

سے بھی قریب تر ہوتی چلی گئی۔ اِدھر شمالی ہند میں بھی اردو زبان عام بول چال کی زبان کی حیثیت سے خوب ترقی کرتی رہی۔ لیکن اس درمیان ادب برائے نام تھا۔ ولی نے اس سلسلے میں پیش قدمی کی جس میں انھیں کامیابی ملی، اور اس کامیابی سے متاثر ہو کر دلی اور پھر شمالی ہند میں پہلے اس کے شاعروں اور بعد میں نثاروں نے وہ گل بوٹے کھلائے جو آج گلستان ادب کی آبرو بنے ہوئے ہیں۔

زبان کے تشکیلی عناصر ہی اس کے رخ کا تعین کرتے ہیں۔ آج اردو جس مقام پر ہے اور جن جہتوں کی نقاب کشائی میں لگی ہے اور مستقبل میں یہ جن مقامات سے گزرے گی اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ اردو کی صحافت ہو، شاعری ہو، تنقید ہو یا فکشن سب اپنے محور اصل کے گرد چکر کاٹ رہے ہیں اور یہ محور ہے ہندوستانیت، کوئی بھی زبان اپنے تہذیبی سروکار (آسانی کے لیے لسانی سروکار) کو فراموش کر کے وہ کردار نہیں ادا کر سکتی جس کی ہم اس سے توقع رکھتے ہیں۔ اردو آج تک ان توقعات پر پوری اتری ہے اور آئندہ بھی پوری اترے گی۔

●●●

www.taemeernews.com

ڈاکٹر محمد کاظم

پرفارمنگ آرٹ اور اُردو

یہ بات تسلیم کی جا چکی ہے کہ جس زبان کا رشتہ روزی روٹی سے نہیں ہوتا اس کا فروغ رک جاتا ہے اور ایک دن ایسا آتا ہے کہ وہ مردہ زبان کہلاتی ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے سامنے ایسی کئی زبانیں موجود ہیں۔ اس مفروضہ کو اُردو زبان غلط ثابت کر رہی ہے۔ اس کا رشتہ روزی روٹی سے روز بروز ٹوٹتا جا رہا ہے جبکہ اس کی اہمیت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے اور اس کا فروغ بہت تیزی سے ہو رہا ہے اور اس کی واحد وجہ پرفارمنگ آرٹ میں اس کی بڑھتی ہوئی اہمیت اور ضرورت ہے۔ پرفارمنگ آرٹ کے زمرے میں آنے والا کوئی بھی فن خواہ وہ رقص ہو یا موسیقی یا پھر ڈراما ایسا نہیں ہے جو اُردو کے سہارے کے بغیر ایک قدم بھی کامیابی کے ساتھ چل سکتا ہو۔

ہم اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ زبان الفاظ کے انبار کا نام نہیں ہے اور نہ ہی زبان صرف آواز کا نام ہے بلکہ زبان ایک تہذیب کا نام ہے اور اُردو زبان اپنے اندر جو تہذیب لیے ہوئی ہے اس کی اہمیت اور طاقت سے اُردو دوست تو کیا اُردو دشمن بھی انکار نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج میڈیا اور پرفارمنگ آرٹس سے تعلق رکھنے والا ہر شخص اس کے پیچھے بھاگ رہا ہے اور اُردو بولنے، سننے اور سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر کوئی شخص صحیح تلفظ کے ساتھ اُردو بولتا ہے تو ہر شخص اس کی طرف حسرت بھری نگاہ سے دیکھتا ہے۔ خواہ وہ نیوز ریڈر ہو یا اداکار، مقرر ہو یا گلوکار، اگر اس کا ش-ق -درست ہے تو اسے دوسرے موضوعات پر زیادہ جاننے والوں پر

www.taemeernews.com

فوقیت دی جاتی ہے۔ جس کا فائدہ اُردو والے اٹھا رہے ہوں یا نہیں لیکن غیر اُردو والے اس کا فائدہ ضرور اٹھا رہے ہیں اور نتیجتاً اُردو والوں کا رشتہ معیشت سے قائم ہو یا نہیں اُردو روزی روٹی کی ضرورت بنتی جا رہی ہے۔

یہ عرض کرتا چلوں کہ پرفارمنگ آرٹ کی زبان کا تعین رسم الخط کے بجائے فنکار کے ذریعہ ادا کیے جانے والی زبان سے ہوتا ہے۔ اس کی اسکرپٹ فنکار کی سہولت کے مطابق اختیار کی جاتی ہے۔ اس لیے پرفارمنگ آرٹ کی زبان کا تعین اس کے رسم الخط سے نہیں کیا جا سکتا۔

اگر ہم اُردو زبان کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ۱۹ ویں صدی کو اُردو کا زریں عہد کہہ سکتے ہیں۔ یہ وہی دور ہے جس میں ایک طرف مغل حکومت کا زوال ہو رہا تھا تو دوسری طرف اُردو کو حکومت میں جگہ مل رہی تھی۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کا زور بڑھ رہا تھا تو ساتھ ہی ساتھ اُردو کی تہذیب بھی زور پکڑ رہی تھی۔ رقص و سرود کی محفلیں آراستہ ہو رہی تھیں۔ اب تک رقص کو عبادت کے طور پر استعمال کرتے تھے تو اسے محظوظ ہونے کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا۔ رقص میں کتھک خالص مندر کا رقص تھا۔ وقت اور حالات نے مغلیہ عہد کے درباری آداب و اخلاق کا رنگ کتھک پر چڑھانا شروع کر دیا تھا۔ مکٹ، پٹکا اور پیتامبر کی جگہ چوڑی دار پائجامے، پیشواز، مخملی شال اور سلمٰی ستارے کی کشتی نما ٹوپی نے لے لی۔ نمسکار کو سلام اور پرویش کو آمد کہا جانے لگا۔ نرتیہ اور سنگیت آچاریوں کو استاد جی بنا کر نوازا گیا۔ گویا اس کی مغل دربار نے پذیرائی کی اور بعد میں اسے اودھ کے نوابوں نے بھی سراہا۔ اس رقص میں جو رس آیا وہ انھیں درباروں کی دین ہے۔ اس رقص کو مندر سے بھگتی بھاؤ نا ملی تو مغل دربار سے نشاط آفرینی۔ نواب واجد علی شاہ خود رقص سے دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے کئی چھتیس ایجادی رہس ترتیب دیے اور اس میں خود حصہ لیا۔ ان لوگوں نے ایسا کیا تو اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کیونکہ وہ زمانہ ہی اُردو تہذیب کا تھا۔ دلی، لکھنؤ اور حیدرآباد سمیت بہت سے علاقے ایسے تھے جہاں اُردو ہی بولی جاتی تھی لیکن آج کے اس اُردو مخالف دور میں اگر اُردو کے کلام کو رقص کے لیے منتخب کیا جاتا ہے تو یہ بڑی بات ہے۔ اس سے اُردو کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ملک تقسیم ہوا اور پاکستان کی سرکاری زبان کے طور پر اُردو کو قبول کیا گیا اس کے بعد اگر ہندوستان میں اوما شرما جیسی کتھک ڈانسر کچھ نیا کرنے کے لیے غالب کی غزل کا انتخاب کرتی ہیں اور نینا دیوی غالب کی غزل کی دھن تیار کر کے اس پر کتھک کا پروگرام پیش کرواتی ہیں جو بے حد مقبول ہوتا ہے اور اس کے بعد یعنی

www.taemeernews.com

۱۹۴۹ء کے بعد سے اب تک مسلسل اُردو کے کلام پر رقص تیار کر کے نہ صرف برصغیر بلکہ پوری دنیا میں پیش کر رہی ہیں۔ شیلا دھر (درد آئے گا دبے پاؤں-فیض) اور شوبھنا نرائن (چراغ دیر غالب-سردار جعفری کے کلام) نے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لیے اُردو شاعری کا انتخاب کیا۔ وہ اس فن کے لیے جس کی سرشت میں سنسکرت تہذیب شامل ہے۔ اس کی مدرائیں، بھنگیمائیں سنسکرت کی ہیں۔ ایسے میں اُردو شاعری کا ان ڈانسروں کو متاثر کرنے کا جو جدید رجحان ہے وہ اُردو زبان کے لیے حوصلہ افزا ہے کیونکہ ان کلام پر مبنی رقص لیکر وہ جہاں بھی جاتے ہیں وہ وہاں اُردو کو بھی پہنچاتے ہیں اُردو کو بھی فروغ دیتے ہیں۔

یہ بات شروع سے ہی کہی جارہی ہے کہ اُردو شرفا کی زبان ہے۔ اعلیٰ ذوق وشوق رکھنے والوں کی زبان ہے۔ گویا اگر سماجی طور پر دیکھیں تو یہ Status Symbol بھی رہی ہے۔ آج وہ دور نہیں ہے اور نہ ہی اب اُردو Status Symbol ہے۔ لسانی اعتبار سے دیکھیں تو نہ تو اس کی کوئی سیاست ہے اور نہ ہی کوئی علاقہ اور معاشی طور پر تو سب سے پچھڑی ہوئی ہے۔ ایسے میں موسیقی اعلیٰ طبقہ کو محظوظ کرنے کا ذریعہ بن گئی ہے اور موسیقی میں اب غزل کو ایک اہم مقام مل گیا ہے۔ وہ بھی اس دور میں جب مغربی موسیقی کا زور نہ صرف بڑھ رہا ہے بلکہ نوجوانوں کے دلوں میں گھر کرتا جارہا ہے۔ لیکن یہ پوپ اور جینر بھی زبان کے معاملے میں مجبور و بے بس نظر آرہی ہے کیونکہ الفاظ کے طور پر اسے اُردو کا بدل نہیں مل پارہا ہے۔ مغربی موسیقی کا عالم یہ ہے کہ وقتی طور پر تو اس پر تھرک لیتے ہیں لیکن دل و دماغ کو سکون نہیں ملتا۔ گویا آج کا سچ یہ ہے کہ موسیقی کی ہر وہ محفل ادھوری ہے جہاں غزل نہ گائی جائے اور دوسرا سچ یہ بھی ہے کہ غزل گا کر گلوکاروں نے اپنی امیج بھی بنالی ہے۔ کے. ایل. سہگل سے لے کر انوپ جلوٹا تک تمام (غزل گانے والے) گلوکار اپنے ہر پروگرام میں غزل ضرور پیش کرتے رہے ہیں۔ چونکہ غزل گانے کے لیے اُردو کے الفاظ اور اس کی تہذیب سے واقف ہونا بھی ضروری ہے اس لیے تقریباً گلوکاروں نے نہ صرف اُردو بولنا سیکھا ہے بلکہ اس کی تہذیب سے بھی آشنا ہونے کی کوشش کی ہے اور تب جا کر غزل کو بہتر صورت میں پیش کیا تو اس کی معنویت ابھر کر سامنے آئی ہے۔ اس لیے اس کوشش میں ہر گلوکار لگا ہوا ہے کہ وہ اُردو کے بارے میں زیادہ جانکاری حاصل کرے۔ یہی وجہ ہے کہ کے. ایل. سہگل، بیگم اختر، محمد رفیع، طلعت محمود، برکت علی، لتا منگیشکر وغیرہ نے غزل کو اپنی گلوکاری کا حصہ بنایا تو مہدی حسن اور غلام علی نے غزل گانے والوں کی پوری نسل تیار کی۔ جگجیت

www.taemeernews.com

سنگھ اور چترا سنگھ اسی نسل سے تعلق رکھتی ہیں، جنہوں نے غزل کے ذریعہ ہی اپنی پہچان بنائی ہے اور آج غیر اُردو داں طبقہ بھی اگر امیر خسرو، میر، غالب، مومن، اقبال، فیض، داغ، ظفر، ذوق، بیزار لکھنوی، فانی، اصغر، شکیل بدایونی، جگر مرادآبادی، آنند نرائن مُلّا اور سردار جعفری کے ساتھ ساتھ دوسرے غزل گو شعرا کو جانتا ہے تو بہت حد تک یہ موسیقی کی بھی دین ہے۔

موسیقی میں غزل گائیکی کے ساتھ ساتھ قوالی اور گیتوں کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ ہندوستان میں لوک گیت زبانوں سے زبانوں تک اور سینوں سے سینوں تک منتقل ہوتا رہا ہے۔ اس کا گہرا رشتہ مذہب سے بھی رہا ہے۔ مندروں، مٹھوں، پاٹھ شالاؤں میں عوامی گیت گائے جاتے رہے ہیں۔ یہ تمام گیت عوامی زبان میں لکھے جاتے تھے۔ محفوظ رہ جانے والے گیتوں میں بھکتی کے گیتوں کی تعداد زیادہ ہے۔ خانقاہوں میں قوالیاں اور عوامی گیت یا ہلکی پھلکی غزلیں سماع کی حد بندیوں میں گونجیں۔ قدیم رشتوں کو ہمارے صوفیا نے پورے اعتماد اور خلوص سے آگے بڑھایا ہے۔ خانقاہوں کے سلسلے، عرسوں وغیرہ کے مواقع پر ایک طرح کے گیت ملک کے طول وعرض میں پھیلا دیتے تھے۔ مرشد سے عقیدت رکھنے والے قوال انہیں اپنے مؤثر لہجے میں شہر بہ شہر گا کر دلوں میں گھر کر لیتے اس جانب سب سے پہلے مولوی عبدالحق نے اپنی تصنیف ''اُردو کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ'' میں توجہ دلائی۔ اس کے باوجود اب تک اس طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔ حالانکہ آج بھی قوالی بے حد مقبول ہے اور درگاہوں و خانقاہوں میں قوالیاں گائی جارہی ہیں۔ اکثر قوالیوں کے مقابلے اور قوالوں کی جوڑی داد تحسین حاصل کررہے ہیں۔ قوالی گانے والے تمام فنکار امیر خسرو کے کلام سے ہی قوالی کا آغاز کرتے ہیں۔ ہلکی پھلکی غزل کے ساتھ سنجیدہ محفلوں میں غالب، میر اور فیض جیسے شاعروں کو بھی گاتے ہیں۔

اُردو میں مرثیہ خوانی کی مضبوط روایت موجود ہے۔ اگر چہ اس پر غور کریں تو پرفارمنگ آرٹ کے زمرے میں مرثیہ خوانی کو بہ آسانی جگہ دے سکتے ہیں۔ کیونکہ آواز کے اتار چڑھاؤ، چہرے کے تاثرات اور بدن کی جنبشوں سے مضمون کی تصویر کھینچنا مرثیہ خوانی کے اہم عناصر قرار پائے ہیں۔ یہ تمام وصف ڈراما یا دوسرے پرفارمنگ آرٹ میں بھی خاص مقام رکھتے ہیں۔

مرثیہ کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُردو کے پہلے باضابطہ مرثیہ گو شاعر میر ضمیر کو مرثیہ خوانی میں اشاروں اور ہاتھ سے بتانے کا موجد کہا گیا ہے۔ اگر چہ مرثیہ خوانی کی روایت پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ میر ضمیر کے معاصر اور میر انیس کے والد میر مستحسن خلیق بھی باکمال مرثیہ خواں

www.taemeernews.com

تھے۔ لیکن میر ضمیر کے برخلاف وہ ہاتھوں اور بدن کو حرکت دینے کے بجائے صرف آنکھوں کی گردش، چہرے کے تاثرات اور آواز سے کام لیتے ہوئے بہت ہی مؤثر انداز میں مرثیہ پڑھتے تھے۔ آگے بڑھنے پر جانکاری ملتی ہے کہ ضمیر کے شاگرد مرزا سلامت علی دبیر نے مرثیہ خوانی میں اپنے استاد کی روش اختیار نہیں کی۔ وہ ہاتھوں اور آنکھوں کے اشاروں کے بجائے صرف آواز کے مدوجزر اور لہجے کی تبدیلی سے کام لیتے تھے۔ دبیر کے ہم عصر انیس کے بارے میں علم ہوتا ہے کہ وہ بھی مرثیہ خوانی میں زیادہ تر آنکھوں اور آواز سے کام لیتے تھے۔ اور اعتدال کی حد میں رہتے ہوئے کبھی کبھی ہاتھوں کے اشاروں سے بھی کام لیتے تھے۔ پروفیسر نیر مسعود نے اپنے ایک مضمون میں مرثیہ خوانی کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے اس کے پانچ فنی لوازم گنوائے ہیں۔

۱۔ آواز، ۲۔ لہجہ، ۳۔ ادائے الفاظ، ۴۔ آنکھوں اور چہرے سے اظہار، ۵۔ بتانا۔

مرثیہ خوانی کے فن کو میر انیس نے معراجِ کمال تک پہونچا دیا۔ انھوں نے اس فن کو جس درجہ کو پہونچایا دراصل وہ تمثیل (ڈراما) کا فن تھا۔ لیکن اس تمثیل اور اداکاری کے مروجہ فن میں فرق تھا۔ جس کی وضاحت سید مسعود حسن رضوی ادیب نے ان الفاظ میں کی ہے:

> ''ایکٹر گویا صورت شکل، لباس، وضع قطع میں بالکل ویسا ہی بن جاتا ہے جیسا وہ شخص جس کا کردار اسے ادا کرنا ہے... لیکن مرثیہ خوانی کا کمال دیکھیے کہ ایک شخص اپنے معمولی لباس اور اصلی صورت میں آتا ہے اور صرف لہجے کی تبدیلی، چہرے کے تغیر، جسم اور اعضاء کی معمولی سی جنبش، آنکھ کی خفیف سی گردش سے ہر صنف، ہر عمر، ہر حیثیت، ہر استعداد، ہر ذہنی کیفیت والے انسان کی تصویر پیش کرتا ہے... اہل مجلس کی آنکھیں مرثیہ خواں کی صورت دیکھتی ہیں۔ اور کان اس کے الفاظ سنتے ہیں لیکن... ذہن کسی دوسری ہستی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔''

(میر انیس کی خوش آوازی، خوش بیان اور مرثیہ خوانی)

اور مرثیہ خواں کا یہی کمال ذہن کو دوسری طرف منتقل کر دیتا ہے۔ جو بظاہر تو مرثیہ خواں کو دیکھ رہا ہوتا ہے لیکن حقیقتاً ان کی آنکھوں کے سامنے وہ مناظر ہوتے ہیں جس کا بیان ہو رہا ہے۔ اور یہی چیز اس فن کو اداکاری سے کسی حد تک الگ کرتی ہے۔ آج کی مجلسوں میں بھی اسے بخوبی دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔

www.taemeernews.com

مرثیہ خوانی کے ساتھ ساتھ مشاعرہ پڑھنا بھی پرفارمنگ آرٹ کے زمرے میں آتا ہے۔ ہر دور میں مشاعرہ پڑھنے کے لیے شاعروں نے اپنا خاص انداز اختیار کیا ہے جس کی وجہ سے انھیں مقبولیت ملی ہے۔ جدید دور میں تو بعض شعرا کو ان کے کلام کے بجائے ان کے مشاعرہ پڑھنے کے انداز کی وجہ سے مقبولیت ملی ہے۔ بعض شعرا کو ادب میں تو کوئی مقام نہیں مل سکا لیکن مشاعروں کے مقبول شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ موجودہ دور میں دیکھیں تو بعض شاعر ایسے ہیں جن کا ادبی مقام تو متعین نہیں ہے لیکن مشاعروں میں ان کا مقام متعین ہو چکا ہے اور ان کا تعارف کراتے ہوئے بڑے فخر کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ یہ مشاعرہ کے مشہور شاعر ہیں۔ بعض شعرا کا کلام مشاعروں میں خود ان کی زبانی سنتے وقت بالکل سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ شعر پڑھنے کے بجائے انداز پر زیادہ زور ہوتا ہے اس لیے اکثر شعر کے آدھے الفاظ شعر ادا ہی نہیں کرتے۔ بعض شعرا اپنے کلام کے زیادہ تر الفاظ تیز رفتاری سے ادا کرتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ تمام شعرا مشاعروں کے مقبول شاعر رہے ہیں اور آج بھی ہیں۔ ان کی مقبولیت کی وجہ کلام نہیں بلکہ ان کا مشاعرہ پڑھنے کا انداز ہے۔ ان میں سے زیادہ تر تو باضابطہ مشق کر کے مشاعرہ پڑھنے آتے ہیں ان میں اداکاری کے تمام عناصر بخوبی دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب مشاعروں کے بجائے پرفارمر مشاعرہ لوٹنے میں کامیاب ہوتے ہیں اور مشاعرہ کے کامیاب شاعر ہونے کی وجہ سے پوری دنیا میں بلائے جاتے ہیں اور مشاعرہ پڑھ کر نہ صرف داد پاتے ہیں بلکہ مناسب معاوضہ بھی وصول کرتے ہیں۔

ڈراما واحد ایسی صنف ہے جو اپنے اندر تمام پرفارمنگ آرٹس کے ساتھ ساتھ سارے فنون لطیفہ کو سمیٹے ہوئے ہے۔ پرفارمنگ آرٹ کے زمرے میں آنے والا قدیم ترین فن ڈراما ہی ہے۔ جو زبان کی ابتدا سے بہت پہلے ہی نقل اور سوانگ کی شکل میں موجود تھا۔ زبان کی ابتداء کے بعد یہ ترقی کے منازل طے کرتا ہوا رہس اور پھر اندر سبھا کی شکل میں مکمل طور پر ہمارے سامنے آیا۔ قدیم ترین فن ان معنوں میں کہ انسان نے پہلے اشارے کنائے میں بات کرنا شروع کیا پھر نیم قبائلی دور میں شام کے وقت آگ جلا کر اس کے گرد لوگ جمع ہوتے اور شکار کے دوران پیش آنے والے واقعات و حادثات کو وہاں کر کے دکھاتے۔ جیسے جیسے انسانوں نے ترقی کی، اس فن نے بھی ترقی کے منازل طے کیے۔ اُردو ڈراما کی باضابطہ شروعات سے پہلے ہی اُردو نہ صرف عوام بلکہ سرکاری کام کاج کی زبان کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ اور عوام میں نقل اور سوانگ تفریح کا خاص اور مقبول ذریعہ بن چکا تھا۔ جو نقلیں پیش کی جاتیں ان میں کوئی

www.taemeernews.com

مکمل پلاٹ یا قصہ نہیں ہوتا تھا بلکہ چند من گھڑت واقعات کو لے کر اسے ڈراما کے انداز میں پیش کیا جاتا تھا۔ ان نقلوں کا کمال یہ تھا کہ اس سے منسلک لوگ فی البدیہہ بولنا اور بہروپ بھر کر برجستہ مکالمے ادا کرنا شروع کر دیتے۔ ان فنکاروں میں کسی قسم کی جھجھک نہ ہوتی اور بلا تصنع اپنی بات مکالموں کی شکل میں رکھ دیتے تھے۔ اکثر نقل کسی شعر سے شروع کرتے۔

ایک شعر دیکھیں:

شور وغل کرنا نہیں میرے بھائی جان
سچی ہے یہ داستان سنو لگا کر دھیان

(شری کرشن کی نقل حقیقت رائے)

یہ نقال بہت حاضر دماغ ہوتے تھے۔ ایک واقعہ ہے کہ ایک صاحب نے خوش ہو کر نقالوں کو دوشالہ پیش کیا جو قدرے بوسیدہ تھا۔ دوشالہ نقالوں کو پسند نہیں آیا۔ انہوں نے فوراً ایک نقل تیار کی ان میں سے ایک شخص حاجی بن گیا اور بقیہ نقال اس کے گرد جمع ہو گئے۔ حاجی سے حج و زیارت کا حال دریافت کرنے کے بعد پوچھا۔

نقال I: حاجی صاحب! آپ کوئی خاص چیز نہیں لائے۔

حاجی: (وہی دوشالہ پیش کرتے ہوئے) یہ بیش قیمتی دوشالہ لایا ہوں

نقال II: حضرت دوشالہ تو یہاں بھی مل جاتا، اس میں ایسی کیا خاص بات ہے سات سمندر پار سے لانا پڑا۔

حاجی: (سوراخوں کی طرف اشارے کرتے ہوئے) آپ دیکھ رہے ہیں اس میں کیا لکھا ہے؟

نقال III: بجا ارشاد! یہ آیات کلامِ مجید یا حدیثیں ہوں گی۔

نقال I: تب تو یہ بہت متبرک چیز ہے۔

حاجی: کیسی بے وقوفانہ باتیں کرتے ہو۔ اس میں آیات کلام پاک یا حدیثیں کہاں سے ہوں گی؟

سارے نقال: کیوں؟ کیوں نہیں ہو سکتے؟

حاجی: ارے بے وقوفو! یہ دوشالہ رسول اکرم کے عہد سے بہت پہلے کا ہے۔ پھر اس میں آیات کلام پاک یا حدیث نبویؐ کا ذکر کیونکر ممکن ہے۔ ہاں، البتہ عربی میں ایک

www.taemeernews.com

فیاض گھرانے کے حالات ضرور لکھے ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر آیا کہ ڈراما وہ واحد صنف ہے جس میں پرفارمنگ آرٹس کے ساتھ ساتھ تمام فنون لطیفہ کو ایک ساتھ ایک ہی اسٹیج پر بیک وقت پیش کیا جاتا ہے۔ اس لیے چند ایسے فنون ہیں جو پرفارمنگ آرٹس کے زمرے میں تو نہیں آتے ہیں لیکن پرفارمنگ آرٹ یعنی ڈراما میں اس کا بخوبی اور کامیاب استعمال کیا جاتا ہے۔ حالانکہ فنون لطیفہ ایک الگ مقالہ کا متقاضی ہے۔ میں یہاں مصوری اور مجسمہ سازی اور اُردو سے متعلق چند باتیں عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا۔

ہم سب جانتے ہیں کہ مصوری کا میڈیم الفاظ کے بجائے خطوط کو بنیاد مان کر رنگوں کے ذریعہ اظہارِ خیال کرتا ہے۔ اُردو اشعار کے مصورانہ عمل میں رنگوں اور اشکال کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جدید مصوری میں سب سے پہلے عبدالرحمٰن چغتائی (۱۹۷۵۔۱۸۹۵ء) نے غالب کے اشعار کو موضوع بنا کر اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ نوجوان چغتائی نے واٹر کلر میں جو تصویریں بنائیں انہیں ''مرقع چغتائی'' کے نام سے ۱۹۲۸ء میں نواب بھوپال کی مدد سے شائع کیا گیا۔ یہاں سے مصوری کی دنیا میں ایک انقلاب آیا۔ اب تک نہ صرف مشرقی بلکہ مغربی مصوری بھی بڑی حد تک اپنے مصورانہ عمل کے لیے ماڈل اور مذہب کی محتاج تھی جس کی واضح مثالیں عالمی شہرت یافتہ مصور فائل کی ماڈل ''لاولٹا'' اور لیناردو کی ماڈل ''مونالیزا'' اور مقدس مریم اور حضرت عیسیٰ کی شبیہیں تھیں۔ لیکن چغتائی نے اس سے انحراف کر کے اشعار کو اپنی مصوری کے ذریعہ پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ مرقع چغتائی کی کامیاب پذیرائی کے بعد چغتائی نے نواب بھوپال کی قدر افزائی کا اعتراف کرتے ہوئے غالب کے اشعار کا ایک اور نقش ''نقش چغتائی'' کے نام سے شائع کیا۔ ان دونوں مرقعوں میں مردانہ اور نسائی پیکروں کے حوالے سے غالب کے جن اشعار کی شرح پیش کی گئی ہے۔ ان میں سے دو اشعار دیکھیں:

مئے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

اس کے بعد جن مصوروں نے اس طرف خاطر خواہ توجہ دی۔ ان میں صادقین ایک اہم اور معتبر نام ہے جنہوں نے اپنے مخصوص اسلوب میں اُردو کے منتخب اشعار کی شرح کی۔ صادقین

www.taemeernews.com

کے یہاں وہ شعر بھی ہیں جنہیں چغتائی Paint کر چکے تھے لیکن دونوں کی مصورانہ تشریحات اور Treatment بالکل مختلف ہیں۔ صادقین نے اشعار کی کیلی گرافی کرتے ہوئے رنگوں کے حوالے سے اس کی تفہیم کا حق ادا کیا ہے۔

غالب صدی کے دوران غالب اکیڈمی نے اپنے سرپرست حکیم عبدالحمید صاحب کی ایما پر ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے مصوروں کو غالب کے اشعار Paint کرنے کی تحریک دی۔ ادب اور مصوری کی تاریخ میں شاید یہ پہلا کامیاب تجربہ تھا جب ملک کے تقریباً بیس ممتاز مصوروں نے غالب کا شعر Paint کرتے ہوئے ایک ساتھ اس کی شاعرانہ عظمتوں کا اعتراف کیا تھا۔ یہ تمام Painting آئیل میں تھیں۔ اس میں شریک ہونے والے مصوروں میں زیادہ تر مصور اُردو والے نہیں تھے۔ جن مصوروں نے اس میں حصہ لیا ان میں جے سوامی ناتھن، غلام رسول سنتوش، لکشمن بائی، رام چندرن، مقبول فدا حسین، انیس فاروقی، وائی کے شکلا، بیرن ڈے، کے سری نواسالو، آر مجمدار، جنیت پارکو، پریتوش یعنی شانتی دے اور کے ایس کلکرنی اہم ہیں۔ غالب صدی کے دوران ہی "غالب مصور" کے عنوان سے غالب کے اشعار کی تشریح رام کمار شرما اور فیض مجاہد نے بھی کی تھی۔ آمنہ آبوجہ نے خاص طور سے گھوڑے کی علامت کے سہارے غالب کے کئی اشعار کی کیلی گرافی کی ہے۔ مصوری کے ساتھ ساتھ مجسمہ ساز سنگ ریزوں کی مدد سے تشریح کرنے کی کوشش میں پیش پیش رہے ہیں۔ کشوری لال نے غالب کو اپنا دیوان لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی آرٹس فیکلٹی کے سامنے کھڑا کیا ہے تو برجندر سیال نے سنگ ریزوں کی مدد سے غالب کے ان گنت اشعار کی تجسیم کی ہے۔

جب تک اُردو زبان کو سرکاری سرپرستی حاصل رہی اُردو ڈراما مکمل صورت میں ہمارے سامنے نہیں آیا۔ لیکن جیسے ہی اس کے سر سے برطانوی حکومت کا سایہ سرکنے لگا اُردو ڈرامے نے مکمل صورت اختیار کرنے کی طرف قدم تیز کر دیا اور برطانوی حکومت کی باضابطہ مخالفت یعنی پہلی جنگِ آزادی (۱۸۵۷ء) سے صرف پانچ سال قبل مکمل اُردو ڈراما اندر سبھا لکھا گیا اور صرف تین سال قبل اسے عوام کے درمیان کھیلا گیا۔ اس کے بعد تو گویا ڈرامے کا نام ہی اندر سبھا پڑ گیا اور پورے ہندوستان میں اندر سبھا کھیلا جانے لگا۔ اسی کی تقلید میں پہلے ڈھاکہ میں تجارتی کمپنیاں قائم ہوئیں اور پھر اس کے زوال کے بعد پارسی تھیٹر منظر عام پر آیا۔ پارسی تھیٹر کو بھی ہم نے تجارتی تھیٹر کہہ کر نظر انداز کر دیا۔ جبکہ اُردو زبان کے ساتھ اُردو ادب کو بھی عوام کے دلوں تک پہنچا رہا تھا۔ آغا حشر اپنے آخری دور میں ڈراما کو ادب اور سماج کی طرف سنجیدگی سے لا رہے تھے۔ اس کے بعد اِپٹا

www.taemeernews.com

پھر پرتھوی تھیٹر، ہندوستانی تھیٹر، نیا تھیٹر اور اس کے بعد مختلف ڈراما گروپس اور شخصیات نے ڈراما کے ذریعہ کس قدر اُردو کو عوام کے دلوں تک پہنچایا ہے ہماری نظر اس طرف نہیں جاتی۔ نظر جاتی ہے تو صرف اس طرف کہ اُردو جاننے والوں کی روزی روٹی چھنتی جارہی ہے۔ یہ حقیقت ہے۔ لیکن غیر اُردو داں، کہ جو اُردو رسم خط بھی نہیں جانتے وہ اُردو سے ہی اپنی روٹی روزی حاصل کررہے ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ پرفارمنگ آرٹ کی کوئی متعین اسکرپٹ نہیں ہوتی۔ اس کی اسکرپٹ، فنکار جس رسم خط کو جانتا ہے اسی میں لکھی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستانی فلموں کی زیادہ تر اسکرپٹ رومن میں لکھی جاتی ہے۔ ڈرامے کی زبان کچھ بھی ہو لیکن اس کی اسکرپٹ وہی ہوگی جو اداکار جانتا ہے اور ڈرامے کے زیادہ تر فنکار اُردو رسم خط نہیں جانتے ہیں۔ اس لیے پرفارمنگ آرٹ کی زبان وہی ہوگی جو اس کے ذریعہ ادا ہوگی۔ زیادہ تر غزل گانے والے ناگری رسم خط میں غزل پڑھتے ہیں تو غزل کی زبان ہندی نہیں ہوجاتی، بات ہورہی تھی کہ غیر اُردو داں اُردو سے اپنی روٹی روزی کمارہے ہیں۔ آج ہم کسی بھی پرفارمنگ آرٹ کو لیں اس میں زیادہ تر غیر اُردو داں نظر آتے ہیں لیکن اس کی زبان اُردو سے قریب ترین ہوتی ہے۔ خواہ وہ بھیشم ساہنی، بی وی کارنت، سریندر ورما، پریم کشپ، ایم کے رینا، نصیرالدین شاہ، تری پراری شرماہوں یا پیوش مشرا یا ان جیسے تمام لوگ اُردو رسم خط سے ناواقف ہیں لیکن ان لوگوں نے اپنا زیادہ تر کام اُردو زبان ہی میں کیا ہے اور آج بھی اس کے ذریعہ اپنی روٹی روزی کمارہے ہیں۔ زیادہ تر گلوکار اور موسیقار اردو رسم خط نہیں جانتے لیکن اُردو سے روٹی روزی حاصل کررہے ہیں۔ ڈانسرز اُردو سے نابلد ہیں لیکن اُردو کے کلام پر اپنا رقص پیش کرکے نہ صرف اپنے فن کو چمکارہے ہیں بلکہ یہی ان کا ذریعہ معاش بھی ہے۔ پرفارمنگ آرٹس کے زیادہ تر فنکار اُردو سے ناواقف ہوتے ہیں۔ جب وہ کسی فن کو پیش کرنے کی تیاری کرتے ہیں تو وہ اس دوران اُردو کے الفاظ اور جملوں کے ساتھ ساتھ اُردو کی تہذیب سے بھی واقف ہوتے ہیں اور اس کے بعد وہ غیر اُردو داں ناظرین کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ تو نہ صرف وہ اُردو کے الفاظ ناظرین تک پہنچاتے ہیں بلکہ تہذیب سے بھی آشنا کراتے ہیں اس طرح ایک عام آدمی بھی اردو رسم خط نہ جانتے ہوئے بھی اُردو زبان سے واقف ہوجاتا ہے۔

●●●

www.taemeernews.com

ڈاکٹر شعیب رضا خاں

اُردو زبان کے فروغ میں
اوپن اسکولنگ سسٹم کا حصہ

اس صدی میں انسانی تعلیم پر تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے علم حاصل کرنے میں سیکھنے کا اہم کردار ہے نہ کہ سکھانے اور پڑھانے کا۔ سنسکرت کی ایک کتاب میں بیان کیا گیا ہے کہ ہم کس طرح سیکھتے ہیں۔ اُس میں درج ہے:

- ہماری تعلیم کا ایک چھوتھائی حصہ اُستادوں کے ذریعہ میسر آتا ہے۔
- ہماری عقل اور صلاحیت ایک چوتھائی اور بہم پہونچاتی ہے۔
- مزید ایک چوتھائی ہم اپنے ہمعصروں اور دوستوں سے سیکھتے ہیں۔
- اور بقیہ وقت گزرنے سے تجربے سے حاصل ہوتا ہے۔

ایک اہم سوال یہ ہے کہ کوئی سیکھتا کس طرح ہے اور کیسے سیکھنے کی اپنی مہارتوں کو ترقی دیتا ہے۔ آپ کو عام قسم کے رسمی اسکول میں پڑھنے اور سیکھنے کا تجربہ ہے۔ ممکن ہے یہ تجربہ چند سال کا ہو یا پھر بہت پہلے جوانی کے زمانے میں اس تجربے سے گزرے ہوں۔ آپ کو استاد نے جو کچھ پڑھادیا اسے آپ نے سمجھنے اور سیکھنے کی کوشش کی ہوگی۔ اس طرح استاد آپ کا لیڈر اور آپ اس کے پیروکار تھے۔

نیشنل اوپن اسکول میں سیکھنے کا طریقہ مختلف ہے۔ یہاں سیکھنے کی اولین ذمہ داری طالب

www.taemeernews.com

علم کے اوپر خود ہے۔ سیکھنے کے معاملے میں طالب علم خود ہی لیڈر ہے۔ زور خود سیکھنے پر ہے۔ نیشنل اوپن اسکول میں درسی کتابیں نہیں ہیں بلکہ طالب علم کو'' خود تعلیم دینے والا مواد'' فراہم کیا جاتا ہے۔ آڈیو اور ویڈیو (سمعی اور بصری) پروگرام کے ساتھ ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر بھی اوپن اسکولنگ کے پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ رابطہ کلاسیں ان مراکز پر ہوتی ہیں جہاں طالب علم داخلہ لیتے ہیں۔

نیشنل اوپن اسکول کا مقصد اپنے طالب علموں کو آزادی سے تعلیم دینا اور تعلیم یا ہدایت کو طالب علموں تک ایک آزاد ادارے یعنی اوپن اسکول کے ذریعہ پہنچانا ہے۔ اس کی مدد سے نیشنل اوپن اسکول کے طالب علم مختلف قسم کے مضامین کی فہرست سے اپنی پسند کے مضمون چن سکتے ہیں۔ کسی قسم کی گھبراہٹ یا عجلت کے بغیر اپنے مضامین کو سکون سے پڑھ سکتے ہیں۔ اس طرح مطالعہ کے لیے ایک نئی لگن اور جوش ان میں پیدا ہوسکتا ہے اور دماغی تجسس اور تلاش اور نئی سے نئی معلومات حاصل کرنے کے لیے ان میں ایک طرح کی لذت اور ولولہ پیدا ہوسکتا ہے اور پھر طالب علم میں اپنے بدلے ہوئے حالات کے مطابق خود کو ڈھالنے کی صلاحیت بھی پیدا ہوجاتی ہے۔

طالب علموں کو اسکول کے درجے پر دور بیٹھے تعلیم پہنچانے کے اس نادر طریقے کی بنیادیوں تو سترھویں دہائی کے درمیانی برسوں میں پڑ گئی تھی تاہم ان طالب علموں کے لیے جو اسکول کی تعلیم درمیان میں چھوڑ دیتے ہیں، سکینڈری درجوں کی تعلیم فراہم کرنے کے لیے تمام روایتی اسکولی تعلیم کی جگہ کھلے یا غیر رسمی اسکولوں کا خیال پیدا ہوا تا کہ وہ طالب علم اپنی آسانی اور اپنی رفتار کے مطابق تعلیم حاصل کرسکیں۔ اوپن اسکول جو کہ ہندوستان میں نہیں بلکہ دنیا میں اپنی قسم کا واحد ادارہ ہے۔ جسے وزارت فروغ انسانی وسائل کی ترقی کے شعبۂ تعلیم نے ۱۹۸۹ء میں ایک خودمختار ادارے کے طور پر قائم کیا تھا اور اب اس کا نام نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوپن اسکولنگ ہے اور اس طرح یہ ادارہ تعلیم کے میدان میں قومی پیمانے پر اولین کردار ادا کررہا ہے۔ قومی پیمانے کا ادارہ بننے کے عمل کے دوران اس کے کاموں کے دائرے میں پھیلاؤ پیدا کیا گیا ہے اور اب یہ اپنے مشن کو پورا کرنے کے لیے قومی اور بین الاقوامی سطح پر ہر طرح کی تنظیموں کے کاموں میں شریک ہو رہا ہے اور انھیں اپنا شریکِ کار بنا رہا ہے۔ نیشنل اوپن اسکول کا مشن یہ ہے کہ ایک غیر رسمی طریقہ تعلیم کے ذریعہ طالب علموں کے ترجیحی زمروں کو آج کے حالات کے موافق موزوں اور ان کے لیے ذہنی طور پر ترقی کے مواقع فراہم کرنے والی تعلیم کا مستقل انتظام کرے اور اس طرح

www.taemeernews.com

قومی تعلیم کے مقصد کو حاصل کرنے میں حصہ لے۔ تعلیم کے پھیلاؤ اور اسے عوام تک پہنچانے کے قومی مقصد کو پورا کرنے کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے نیشنل اوپن اسکول نے غیر رسمی بنیادی تعلیم کا منصوبہ بھی تیار کیا ہے۔ اس پروگرام کا مقصد نوخواندہ، جن لوگوں نے تازہ طور پر پڑھنا سیکھا ہے اور ان لوگوں کو جو باقاعدہ طور پر اسکول نہیں جاسکے ابتدائی تعلیم پہنچانا ہے۔

اس ضرورت کے محسوس کرنے کے بعد کہ ہندوستان کی بہت بڑی آبادی میں مختلف قسم کے لوگوں تک تعلیم کو صرف انگریزی اور ہندی میڈیم کے ذریعہ نہیں پہنچایا جاسکتا، نیشنل اوپن اسکول نے ۱۹۹۵ء میں ایک ایسا منصوبہ شروع کیا جس کے مطابق اُردو اور دیگر علاقائی زبانوں میں بھی نصاب تیار کیا گیا۔ تعلیم کو لوگوں کے بالکل دروازے تک پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ طالب علم کی مادری زبان میں ہو اس لیے نیشنل اوپن اسکول کا سکینڈری کورس ۱۹۹۵ء میں اُردو زبان میں شروع کیا گیا۔

نیشنل اوپن اسکول ۱۲ زبانوں میں انتخاب کی سہولت فراہم کرتا ہے، وہ زبانیں ہیں انگریزی، ہندی، اُردو، بنگالی، تلگو، مراٹھی، گجراتی، کنڑ، پنجابی، نیپالی، آسامی اور سنسکرت علاوہ ازیں ۸ دیگر مضامین جیسے ریاضی، سائنس، سماجیات، معاشیات، کاروباری مطالعہ، ہوم سائنس ٹائپ رائٹنگ، ہندی، انگریزی اور اُردو ورڈ پروسنگ انگریزی، کم از کم ۵ مضامین بشمول ایک زبان کا انتخاب لازمی ہے۔ یہ کورس دسویں سطح پر ہے جو کہ ہندی، انگریزی اور اُردو میڈیم میں قومی سطح پر چل رہا ہے۔ اس کے علاوہ ووکیشنل کورس میں بھی انگلش اور ہندی میڈیم کے شانہ بہ شانہ اُردو میڈیم کے پروگرام چل رہے ہیں، جن میں ٹائپ رائٹنگ اُردو دسویں اور بارہویں سطح پر، سکریٹریل پریکٹس اور اسٹینوگرافی بارہویں سطح پر شروع ہوچکے ہیں۔ لائبری سائنس اور ٹیچر ٹریننگ کے کورس بھی اُردو میڈیم میں نئے سال سے شروع کردیے جائیں گے مزید تفصیل کے لیے پراسپکٹس جو کہ ہر سال داخلے کے وقت فارم کے ساتھ شائع ہوتا ہے دیکھا جاسکتا ہے۔

نیشنل اوپن اسکول کیا ہے؟ یہ سوال ہر اُس شخص کے ذہن میں آتا ہے جو اس کے بارے میں جاننا چاہتا ہے۔ کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ اسے نیشنل اوپن اسکول کیوں کہا جاتا ہے؟ یہ نیشنل تو اس لیے ہے کہ ہندوستان بھر سے ہر جگہ کے طلبا کو داخلہ دیتا ہے اور اسکول اس لیے کہ یہ ایک ایسا ادارہ ہے جہاں آپ کچھ سیکھ سکتے ہیں کوئی خاص مہارت حاصل کرسکتے ہیں۔

اوپن اسکول میں اپنا نام لکھانے سے پہلے کچھ طالب علموں نے رسمی تعلیمی دینے والے کسی

www.taemeernews.com

اسکول میں پڑھا ہوگا؟ وہاں اُن کے ساتھ پڑھنے والے ان کے ہم عمر تھے۔ اسکول میں اُن کی حاضری بھی ہوتی تھی، اُن کو اُسی رفتاری سے پڑھنا ہوتا تھا جس رفتار سے اُستاد ان کو پڑھاتے تھے۔ اگر چہ وہ طالب علم سے کچھ زیادہ تیزی سے یا اُس سے سست رفتاری سے پڑھنا چاہتے تھے اور یہ سب پڑھنا لکھنا ایک مقررہ وقت تک ہوتا تھا، اُن کو وہ تمام مضامین پڑھنے ہوتے تھے جو اسکول نے پڑھانے کے لیے مقررہ کرر کھے تھے، ان کے امتحان مقررہ تاریخوں میں ہوتے تھے، اگر وہ کسی وجہ سے امتحان میں بیٹھنے کے لیے تیار نہ بھی ہوں تو بھی ان کو امتحان میں بیٹھنا ضرور پڑتا تھا۔ لیکن دوسری طرف اوپن اسکول اُن کو سیکھنے کی پوری آزادی دیتا ہے۔

جو کچھ وہ چاہیں

جب وہ چاہیں

جیسے وہ چاہیں

جہاں طالب علم چاہیں پڑھائی کر سکتے ہیں

بات دوسری طرح کہنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ اوپن اسکول میں طالب علم پر سب کچھ منحصر ہوتا ہے، بہت زیادہ آزادی دی جاتی ہے اور طالب علم کے بھی اختیار میں ہوتا ہے کہ وہ کس طرح اس اوپن سسٹم سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ دوسرے کھلے طور پر سیکھنے اور سکھانے والے اداروں کی طرح نیشنل اوپن اسکول سیکھنے والے کی مدد کرتا ہے۔

سیکھنے کے مواقع دے کر

خود سکھانے والا سامان دے کر

طالب علموں کی ترقی کے بارے میں معلومات فراہم کر کے

کسی بھی طالب علم کے ساتھ پڑھنے اور سیکھنے والا کسی بھی عمر کا ہو سکتا ہے داخلے کی شرطیں مقررہ اور سخت نہیں ہیں۔ ابتدائی یا ثانوی سطح کے کورس میں کسی طالب علم نے داخلہ لیا ہے تو طالب علم کے لیے عمر کی قید نہیں ہے اگر طالب علم یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس کورس کو مکمل کر سکتا ہے جس کی کتابیں اس کو دی گئی ہیں تو خود اپنی تصدیق پر داخلہ لے سکتا ہے جس کے لیے کسی دوسرے کی جانچ اور منظوری کی ضرورت نہیں ہے۔ اعلیٰ ثانوی کورس کے لیے بہر حال سیکنڈری اسکول کا سرٹیفکیٹ درکار ہوتا ہے۔ یہ اس لیے کہ اگر طالب علم کسی رسمی باضابطہ اسکول یا کالج میں واپس جانا چاہے تو وہ اُس کا سیکنڈری کا سرٹیفکیٹ دیکھنا چاہیں گے۔ پس یہ ایک اجتماعی تدبیر ہے، تا کہ بعد میں طالب

www.taemeernews.com

علم کو اپنی پسند کے کالج میں داخلہ لینے سے محروم نہ ہونا پڑے۔ طالب علم کی تعلیمی مدت اپنی مرضی پر منحصر ہے، بہت سے لوگ کسی کام میں لگے ہوئے ہوں گے یا کچھ گھریلو ذمہ داریاں ان کے ذمہ ہوں گی۔ ہوسکتا ہے کہ سارے کا سارا وقت اپنی تعلیم میں لگا دینا ان کے لیے ممکن نہ ہو۔ اسی وجہ سے اوپن اسکول ان کو اس کام کے لیے پانچ سال کی مہلت دیتا ہے کہ وہ کہیں جلد بازی میں اس کام کو ایک سال ہی میں ختم کرنے کی کوشش نہ کرنے لگیں۔ اس آزاد اسکول میں ہم اس بات پر زور نہیں دیتے کہ تعلیم تیز رفتاری سے حاصل کی جائے بلکہ اسے اچھی طرح حاصل کیا جائے تاکہ کسی مضمون کو اچھی طرح سمجھنے اور پڑھنے کا موقع بھی مل سکے۔

تعلیم حاصل کرنے کی جگہ کوئی بھی ہوسکتی ہے، طالب علم کا اپنا گھر، کام کرنے کی جگہ یا پھر اپنے دوستوں کے ساتھ، اپنے گھر سے قریب کے علاقے میں، طالب علموں کے لیے مقررہ اوقات میں اسکول میں حاضری ضروری نہیں ہے۔ لیکن بلاشبہ طالب علم کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے اپنے طور پر بہت کام کرنا ہوگا۔ طالب علم کے مطالعہ کے لیے مضامین اس کے خود کے پسند کے ہوں گے۔ جب وہ داخلہ فارم بھرنے لگتے ہیں تو ان کو اپنی پسند کے مضامین چننے کی پوری آزادی ہوتی ہے اور وہ اپنی پسند اور ضرورت پر منحصر ہوتے ہیں۔ نیشنل اوپن اسکول یہ آزادی اس لیے دیتا ہے کہ اسے معلوم ہے کہ طالب علم ان مضامین میں کیا کام کریں گے۔ لیکن ہم اس پر اصرار کریں گے کہ طالب علم کم از کم ایک زبان کو ضرور اپنی پسند کے ان مضامین میں شامل کرلیں۔

طالب علم جس تعلیمی مرکز پر داخلہ لیتا ہے، اس کا تعلیمی مرکز تعلیمی کوششوں میں اسے اور آگے بڑھانے میں مدد کرے گا۔ طالب علموں کو دوسرے سیکھنے والوں سے ملانے کے لیے اور استادوں سے تعلق پیدا کرنے کی سہولت مہیا کرنے کے لیے اور بعض نکات کے بارے میں شک وشبہات کو دور کرنے کے لیے نیشنل اوپن اسکول شخصی رابطہ پروگرام بھی چلاتا ہے۔

نیشنل اوپن اسکول میں یہ بھی سہولت ہے کہ اگر طالب علم نہ چاہے تو ایک ہی وقت میں سارے مضامین کا امتحان نہ دے۔ طالب علم کی یہ آزادی ہے کہ ایک وقت میں ایک یا زائد مضامین میں امتحان پاس کرے۔ ایسے طالب علم جو کہ CBSE، ریاستی اوپن اور پنجاب ریاستی ایجوکیشن بورڈ سے ہوں زیادہ سے زیادہ چار مضامین کے کریڈٹ نمبروں کی منتقلی کی سہولت کا فائدہ اٹھاسکتے ہیں اور جہاں تک دیگر بورڈوں کا معاملہ ہے اس میں زیادہ سے زیادہ دو

www.taemeernews.com

مضامین کے کریڈٹ نمبروں کی منتقلی NOS کو کرا سکتے ہیں۔ ان تمام سہولیات کی مزید تفصیلات دستور العمل میں ہر سال فراہم کی جاتی ہیں۔

ہندوستانی تعلیمی خدمات کے میدان میں نیشنل اوپن اسکول فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔ یہ ادارہ دنیا کا سب سے بڑا اوپن اسکول ہے۔ فاصلاتی نظامِ تعلیم میں نمایاں کارکردگی کے لیے اس ادارے کو اعزاز فضیلت سے بھی نوازا جا چکا ہے، جس سے اس کے کام میں مستعدی اور لگن کی لہر پیدا ہوگئی ہے۔ NOS نے تعلیمی سال ۲۰۰۱ سے طلبا کے براہ راست رجسٹریشن کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ اس نئے قدم کی NOS کے امتحانات میں شامل ہونے والے راست رجسٹریشن والے امیدواروں کے بارے میں علاحدہ انفارمیشن بلیٹن بھی دستیاب ہے۔ NOS امتحانات کے مزید نئے طریقے کے انکشاف کے لیے کوشاں ہے جس میں یہ سہولت ہے کہ طالب علم جب چاہے امتحان دے سکتا ہے اس سسٹم کو On Demand System کہتے ہیں۔ جسے جلد ہی شروع کیا جا رہا ہے اس سسٹم کے شروع ہونے سے ایک نئے دور کا آغاز ہوگا۔

●●●

www.taemeernews.com

ڈاکٹر ریاض احمد

فاصلاتی تعلیم اور اُردو

جب کبھی سماج میں تبدیلی رونما ہوتی ہے تو اس کا بالواسطہ یا بلاواسطہ اثر تعلیمی نظام پر مرتب ہوتا ہے۔ چونکہ سماج اور تعلیم ایک دوسرے پر منحصر ہیں اس لیے ایک دوسرے پر پوری طرح اثر انداز ہونے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ صنعتی انقلاب آنے اور دنیا کی آبادی میں بے تحاشہ اضافہ ہونے کی وجہ سے بہت سے ممالک میں سماجی اور معاشی تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کا اثر وہاں کے تعلیمی نظام پر جلد یا بدیر ضرور پڑا۔ مراسلاتی نظام تعلیم/ فاصلاتی نظام تعلیم بھی سماج میں ہونے والی انھیں تبدیلیوں کا مظہر ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی اور جدید سائنسی ترقی اور ٹکنالوجی کی ترقی کے پیدا کردہ وسائل نے تعلیم و تدریس کے میدان میں بھی غیر معمولی تبدیلیوں کو راہ دی ہے۔ روایتی نظام تعلیم اور طریقہ تعلیم سے آگے کچھ نئے طریقے نہ صرف یہ کہ تلاش کیے گیے بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ مراسلاتی تعلیم/ فاصلاتی تعلیم کا تصور بھی ایک حقیقت بن چکا ہے اور تقریباً ۲۰ فیصد سے زائد طلبہ اس طریقہ تعلیم سے فیض حاصل کر رہے ہیں۔

فاصلاتی نظام تعلیم کے ذریعہ دنیا کے تقریباً سبھی علوم و فنون کی تعلیم کا انتظام ہے نیز دنیا کی تمام تر زبانوں کی تدریس اس نظام تعلیم کے ذریعہ کی جارہی ہے کہیں بطور زبان کے اور کہیں Medium of Instruction کے طور پر، اس میں ہندوستانی زبانیں بھی شامل ہیں۔ عام طور سے فاصلاتی نظام تعلیم اس تعلیمی نظام کو کہتے ہیں جس میں طلبہ کو مرکزیت حاصل ہوتی ہے اور

www.taemeernews.com

اساتذہ صرف مشیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔قدیم مراسلاتی طرز تعلیم، تعلیم بالغان، تہذیبی وثقافتی تعلیم، غیر رسمی تعلیم Home based Study وغیرہ کو اسی زمرے میں رکھا جاسکتا ہے اس طرز تعلیم کی بنیادی خصوصیت طلبہ اور اساتذہ سے طبعی دوری ہے، رسمی طرز تعلیم یا عام تعلیمی نظام میں ایک چہار دیواری میں بیٹھ کر تعلیم حاصل کی جاتی ہے اور اس نظام میں اساتذہ کو مرکزیت حاصل ہوتی ہے اس طرز تعلیم کو اساتذہ مرکوز تعلیم (Teacher Centred Education) کہا جاتا ہے۔اس کے برعکس فاصلاتی نظام میں چہار دیواری کی ضرورت نہیں ہوتی، طلبہ پوری طرح اساتذہ پر منحصر نہیں رہتے۔اس میں کوئی خاص نظام الاوقات نہیں ہوتے اور امتحانات کی ویسی پابندی بھی نہیں ہوتی جیسا کہ Formal Education System میں ہوتی ہے اس نظام تعلیم میں طلبہ خود ہی روزمرہ کے اوقات متعین کرتے ہیں اور خود ہی اپنا Time Table مرتب کرتے ہیں۔

فاصلاتی نظام تعلیم ان افراد کو مزید تعلیم حاصل کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہے جو کل وقتی یا جز وقتی نوکری پیشہ ہوں، اپنے معاش کے لیے کسی انفرادی کام میں مشغول ہوں، زرعی کاموں میں لگے ہوئے ہوں یا پھر کسی حد تک Formal Education حاصل کرنے کے بعد ملازمت کی تگ ودو میں مصروف ہو، مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ فاصلاتی نظام تعلیم ان لوگوں کو تعلیم سے دوبارہ جوڑنے والا نظام ہے جو کسی وجہ سے Formal Education حاصل کرنے سے قاصر ہیں۔یہ ذریعۂ تعلیم بہت حد تک Cost effective بھی ہے اور Time effective بھی۔

کچھ مورخوں کا خیال ہے کہ فاصلاتی نظام تعلیم کی بنیاد مشہور مفکر پلوٹو اور سینٹ پال کی تحریروں کے ذریعہ پڑی لیکن قدیم ترین باضابطہ مراسلاتی نظام کے ذریعہ تعلیم کا آغاز ۱۹ویں صدی کے نصف اول میں اسحاق پٹ مین (Isaac Pitman) نے اپنے Short Hand Course کے ذریعہ ۱۸۴۰ء میں کیا۔عام طور سے اس کو اپنی طرز کا اولین فاصلاتی نظام تعلیم تصور کیا جاتا ہے۔لیکن جدید تحقیق کے مطابق اس تعلیمی نظام کی ابتدا ۱۸ویں صدی عیسوی میں ہوئی۔

Broje Holm Berg نے اپنی کتاب Essential Distance Education کے باب اول کے صفحہ ۱۸ پر لکھا ہے کہ ایک امریکی رسالہ بوسٹن گزٹ Boston Gazette میں مورخہ ۲۰ر مارچ ۱۷۲۸ء کو اشتہار دیا گیا جس میں کہا گیا تھا کہ ایک استاد کیلیب فلپس (Caleb Philips) ہفتہ میں چند اسباق ترسیل کیا کریں گے۔

امریکہ میں پہلا منظم مراسلاتی تعلیمی نظام ۱۸۷۳ء سے شروع ہوا اور اسی مراسلاتی نظام

www.taemeernews.com

نے ۱۸۹۰ء میں یونیورسٹی کے Correspondance Course کی بنیاد ڈالی۔ یورپ میں بھی ۱۸۹۴ء میں اس نظام تعلیم کی شروعات ہوئی سویڈن کا Hermods Correspondance School جس نے بعد میں بین الاقوامی شہرت پائی 1898ء میں قائم ہوا۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں یورپ اور امریکہ میں مراسلاتی نظام تعلیم/ فاصلاتی نظام تعلیم کا ایک جال سا بچھ گیا۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں Distance Education کے ذریعے تعلیم میں نمایاں ترقی ہوئی۔ یہ ترقی شمالی امریکہ، مغربی یورپ، آسٹریلیا اور ایشیا میں یکساں نظر آتی ہے کچھ ممالک جیسے آسٹریلیا، جاپان وغیرہ میں فاصلاتی یونیورسٹیوں کا عام چلن ہوگیا۔ کچھ ملکوں جیسے پاکستان، ترکی اور ایران وغیرہ میں فاصلاتی نظام تعلیم پر نئے نئے تجربات کیے گئے اس کی مثال علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے دی جاسکتی ہے۔ تاہم کچھ ممالک میں اس نظام تعلیم کو خاطر خواہ ترقی نہیں ملی۔

فاصلاتی نظام تعلیم کے اداروں کو تین درجات میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔ اول تو وہ اوپن یونیورسٹیاں جو کلی طور پر صرف فاصلاتی نظام تعلیم کی بنیاد پر قائم کی گئی ہیں مثلاً برطانیہ کی اوپن یونیورسٹی پاکستان کی علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

Free University of Iran.

Open University of Sri Lanka.

University of Air Japan.

National Open University Abuja, Nigeria.

Korea Air and Correspondence University.

Indira Gandhi National Open University, New Delhi, India

Al-Quds Open University, Amman, Jordan.

اور بنگلہ دیش اوپن یونیورسٹی، ڈھاکہ وغیرہ ایسی بہت سی یونیورسٹیاں اور فاصلاتی نظام تعلیم کے ادارے ہیں جن کا ذکر کرنا یہاں ممکن نہیں۔

مکمل اوپن یونیورسٹیوں کے علاوہ فاصلاتی تعلیم کے جو دوسرے ادارے ہیں ان کو دُہرے معیاری تعلیمی ادارے یعنی Dual Model Education Institution کہتے ہیں۔ ان اداروں میں Formal اور فاصلاتی دونوں نظام کے تحت تعلیم کا انتظام ہے۔ ایسے اداروں اور

www.taemeernews.com

یونیورسٹیوں کی تعداد کلی اوپن یونیورسٹیوں سے بہت زیادہ ہے۔ ایسے اداروں کی تعداد صرف ہندوستان میں ہی سو سے زیادہ ہے۔ دنیا کے مشہور Dual Model اداروں کی مثال دہلی یونیورسٹی، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد، انا ملائی یونیورسٹی، حیدرآباد یونیورسٹی۔

The University of West Indies, National University of La-plata, Argentina. the University of South Pacific, Fiji, The University of Malaya, Malaysia, Anadobe University Turkey.

ان دونوں طرح کے اعلیٰ سطحی فاصلاتی تعلیمی اداروں کے علاوہ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح کی تعلیم کا فاصلاتی نظام کے ذریعے انتظام کرنے والے اداروں کی تعداد بھی تقریباً نو ہے مثلاً National Institute of Open Schooling جسے پہلے National Open School کے نام سے جانا جاتا تھا اور اسی قبیل کے دوسرے ادارے۔

فاصلاتی تعلیمی اداروں کی حتمی تعداد بتانا تو مشکل ہے تاہم ایک سروے کے مطابق دنیا کے ایک سو تین (103) ملکوں میں (1133) ایک ہزار ایک سو تینتیس سے زیادہ یونیورسٹیاں اور ادارے تقریباً چالیس ہزار (40,000) کورسوں کا انتظام فاصلاتی نظام تعلیم کے ذریعہ کرتی ہیں جن میں کلی فاصلاتی تعلیمی اداروں کی تعداد چالیس (40) ہے جب کہ باقی ادارے جزوی طور پر فاصلاتی تعلیم کا انتظام کرتے ہیں۔

ہندوستان میں باضابطہ طور سے فاصلاتی / مراسلاتی تعلیم کا آغاز دہلی یونیورسٹی میں ۱۹۶۲ء میں ہوا۔ اس کے بعد متعدد ایجوکیشن کمیشن کی طرف سے اس طرز تعلیم کی طرف توجہ دلائی گئی اور دنیا کے تعلیمی میدان میں ہوئی تبدیلیوں کو دیکھتے ہوئے ہمارے ملک میں بھی فاصلاتی تعلیمی اداروں کی کمی محسوس کی جانے لگی۔ ہندوستان میں سب سے پہلی مکمل اوپن یونیورسٹی کا قیام حیدرآباد میں ۱۹۸۲ء میں ہوا جس کا موجودہ نام ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی ہے۔ فی الحال ہندوستان میں مندرجہ ذیل دس اوپن یونیورسٹیاں قائم ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی حیدرآباد، اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی دہلی، کوٹا اوپن یونیورسٹی کوٹا، نالندہ اوپن یونیورسٹی پٹنہ، یشونت راؤ چوہان مہاراشٹر اوپن یونیورسٹی، ناسک، مدھیہ پردیش بھوج اوپن یونیورسٹی، بھوپال، کرناٹک اسٹیٹ اوپن یونیورسٹی، میسور، ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، احمد آباد، نیتاجی سبھاش اوپن یونیورسٹی کولکتہ اور اتر پردیش راج رشی ٹنڈن اوپن

www.taemeernews.com

یونیورسٹی، الٰہ آباد۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ اب تقریباً سبھی ممالک میں فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت تعلیمی ترقی کے منازل طے کیے جارہے ہیں اور شاید ہی دنیا کی کوئی زبان ہو جس کی تدریس فاصلاتی نظام تعلیم کے ذریعہ نہیں کی جارہی ہو۔ چونکہ اردو نے برصغیر میں ترقی کے سبھی منازل طے کیے اس لیے اس زبان کی تدریس دنیا کی دیگر یونیورسٹیوں میں عمومی طور پر اور ہندو پاک کی یونیورسٹیوں میں خصوصی طور پر کی جارہی ہے۔ جہاں تک فاصلاتی نظام تعلیم کے ذریعہ اردو کی تعلیم و تدریس کا سوال ہے تو ہندوستان کے باہر صرف تین یونیورسٹیوں بنگلہ دیش اوپن یونیورسٹی ڈھاکہ، تری بھون یونیورسٹی نیپال اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی پاکستان میں اس کا انتظام ہے۔ ان میں بنگلہ دیش اوپن یونیورسٹی اور تربھون یونیورسٹی نیپال میں صرف اردو زبان کا سرٹیفکیٹ کورس کا انتظام ہے۔ نیز ان یونیورسٹیوں میں سینئر سکینڈری سطح تک بذریعہ فاصلاتی نظام اردو کی تدریس کا انتظام بہت جلد کیا جانے والا ہے جب کہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے سبھی کورسز کا میڈیم ہی اردو ہے۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں کل 1069 (ایک ہزار انہتر کورسز) کا انتظام کیا جارہا ہے۔ زندگی کے مختلف شعبہ سے متعلق یہ سبھی کورسز اردو میڈیم میں پڑھائے جاتے ہیں۔ ان کورسز میں صرف اردو زبان و ادب سے متعلق 90 نوے کورسز پرائمری سطح سے لے کر اعلیٰ تحقیقی سطح تک کا انتظام ہے۔ ان کورسز سے متعلق تیار شدہ تدریسی مواد یونیورسٹی کے ذریعے فراہم کیے جاتے ہیں۔ اردو کے تعلق سے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی پوری دنیا میں اپنی مثال آپ ہے۔ طوالت کے خوف سے یہاں ان کورسز کا تفصیلی تذکرہ نہیں کیا جارہا ہے۔

ہندوستان میں جتنی زبانیں آئین کے آٹھویں شیڈول میں درج ہیں ان سب زبانوں کی تدریس فاصلاتی تعلیم کے ذریعے کی جارہی ہے ان زبانوں میں اردو کا ایک اہم مقام ہے ہمارے ملک میں جو بھی زبانیں پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں ان کو دو زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے پہلے زمرے میں وہ زبانیں ہیں جو Classical Languages کہی جاتی ہیں اور دوسرے زمرے کی زبانوں کو Modern Indian Languages(MIL) کہتے ہیں۔ اردو زبان جدید ہندوستانی زبان کے طور پر پڑھائی جاتی ہے اور اردو زبان کی تدریس اور اس کے ذریعے دیگر مضامین کی تدریس ہمارے ملک میں کئی سطحوں پر کی جاتی ہے۔ فاصلاتی نظام تعلیم کے ذریعہ

www.taemeernews.com

تقریباً اکیس(21) یونیورسٹیوں میں اردو زبان کی تدریس یا اردو کے ذریعہ دیگر مضامین کی تدریس کا انتظام ہے۔ ان میں چھ (6) یونیورسٹیوں کرناٹک اوپن یونیورسٹی، بنگلور یونیورسٹی، کشمیر یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی، بہار یونیورسٹی، مظفر پور اور للت نرائن مشرا یونیورسٹی دربھنگ سے اردو زبان و ادب میں ایم اے کا امتحان بذریعہ فاصلاتی تعلیم دیا جاسکتا ہے انڈر گریجویٹ سطح یعنی بی.اے، بی.کام اور بی ایس سی آنرز/پاس کے امتحانات کرناٹک اوپن یونیورسٹی، الہ آباد یونیورسٹی، برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال، دہلی یونیورسٹی، جموں یونیورسٹی، کرناٹک یونیورسٹی، مدراس یونیورسٹی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد، پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ، پٹنہ یونیورسٹی، اتکل یونیورسٹی بھونیشور، بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی حیدرآباد، کیرالہ یونیورسٹی، یوپی راج رشی ٹنڈن یونیورسٹی، الہ آباد اور اب جلدی ہی جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی سے بذریعہ فاصلاتی تعلیم دے سکتے ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ جو اس سلسلے کی سب سے نئی کڑی ہے، دیگر دس کورسز کا آغاز کرنے جارہی ہے یہ سبھی کورسز اردو میڈیم میں بھی دستیاب ہوں گے۔ ان کورسز میں کئی روزگاری کورسز بھی شامل ہیں۔

اردو زبان و ادب کی تدریس کے علاوہ کئی یونیورسٹیوں میں اردو کو بطور میڈیم یعنی Medium of Instruction کے انتخاب کیا جاسکتا ہے یعنی ان یونیورسٹیوں میں طلبہ کو یہ سہولت حاصل ہے کہ بی.اے اور بی اے آنرس کے تمام مضامین اردو میڈیم میں لکھ سکیں بلکہ ان کو تدریسی مواد بھی اردو میڈیم میں فراہم کرائے جاتے ہیں۔ ان یونیورسٹیوں میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد، ڈاکٹر بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی، حیدرآباد، پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ، عثمانیہ یونیورسٹی، آندھرا پردیش اور جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دلی بطور خاص ہیں۔

چند ایک فاصلاتی تعلیم کے ادارے ایسے بھی ہیں جہاں اردو میں مزید کورسز کی سہولت ہے مثلاً جموں یونیورسٹی غیر اردو داں حضرات کے لیے اردو سرٹیفکیٹ کورس کا انتظام کرتی ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی اس طرح کے ایک کورس کا انتظام بذریعہ فاصلاتی تعلیم برسوں سے کرتی چلی آئی ہے۔ یوپی راج رشی ٹنڈن اوپن یونیورسٹی الہ آباد سے اردو میں ڈپلوما کورس کی سہولت ہے اسی طرح پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ سے اعلیٰ ثانوی یعنی انٹرمیڈیٹ کے امتحانات بھی فاصلاتی تعلیم کے ذریعہ دے سکتے ہیں۔

ایک اور بات جس کا خصوصیت سے تذکرہ ضروری ہے کہ بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی

www.taemeernews.com

حیدرآباد میں داخلے کے لیے جو ٹسٹ لیے جاتے ہیں اس کا میڈیم اردو بھی ہوتا ہے اور اس میں الگ سے اردو کا ایک مضمون بھی شامل ہوتا ہے یعنی داخلہ ٹسٹ میں دوسرے مضامین کے ساتھ اردو مضمون کا بھی ٹسٹ لیا جاتا ہے۔

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ جس زبان کا تعلق روزی روٹی سے جڑا ہوتا ہے نوجوان نسل اسی زبان کے کورسسز کا انتخاب کرنا چاہتی ہیں۔ چونکہ اردو میں روزگار کے مواقع محدود ہیں اس لیے نئی نسل اس طرف راغب ہونے سے کتراتی ہے اور باوجود کئی یونیورسٹیوں میں بذریعہ فاصلاتی تعلیم، اردو کی اور اردو کے ذریعے تعلیم کا انتظام ہے پھر بھی داخلے کم ہوتے ہیں۔ اردو داں حضرات کو چاہیے کہ اس طرف توجہ دیں کہ سرکاری ملازمت میں اردو والوں کو خاطر خواہ جگہ مل سکے تا کہ اردو ذریعۂ تعلیم والے کورسوں کی طرف عوام کی توجہ مبذول ہو سکے۔

●●●

www.taemeernews.com

محکمۂ النسہ
اردو سیل کی سرگرمیاں

ریاستِ دلّی میں اردو زبان کے فروغ و اشاعت اور ریاست کی اردو بولنے والی آبادی کو بعض اہم اور ضروری سہولیات اور لسانی تحفظ فراہم کرنے کے پیشِ نظر حکومتِ ہند کے محکمۂ داخلہ کی جانب سے جاری ''لسانی بیان'' (Language Statement-1958) کو عملی طور پر نافذ کرنے کے لئے ریاست کے محکمۂ النسہ میں اردو سیل کا قیام عمل میں لایا گیا۔

اردو سیل کا مقصد حکومتِ دلّی کے مختلف محکموں/ دفاتر میں اردو سے متعلق اہم اور ضروری امور کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ سرکاری محکموں میں اردو زبان کی ترویج و اشاعت کرنا ہے۔ اس کے لئے سرکار کے مختلف دفاتر میں عوام کے ذریعہ یا عوامی مقاصد سے متعلق احکامات، اعلانات، اطلاعات اور دوسری چیزوں کو اردو، ہندی اور انگریزی میں ترجمہ کرنے کے علاوہ ان امور کی محکمہ جاتی سطح پر انجام دہی کے لئے سرکاری افسران/عملوں کو اردو زبان لکھنے پڑھنے کی ضروری واقفیت فراہم کرانے کے مقصد سے ''اردو تربیتی اسکیم'' کے تحت ''اردو سرٹیفکیٹ کورس، ایڈوانس اردو کورس، اردو ریفریشر کورس/ اردو ورکشاپ، اردو مضمون نگاری/ اردو خوش نویسی'' کے مقابلے بھی منعقد کرائے جاتے ہیں۔ ان کورسوں/ کلاسوں اور مقابلوں کے مختلف زمروں میں حصہ لینے والے افسران اور عملوں کو سفر خرچ تعاون، اوّل، دوم، سوم اور ہر زمرہ میں پانچ حوصلہ افزا انعامات کے علاوہ مومنٹو، سرٹیفکیٹ، مفت کتابیں، ڈکشنریاں اور فرہنگ وغیرہ بھی تقسیم کی جاتی ہیں۔ مذکورہ تمام پروگراموں میں شرکت کے لئے محکمۂ النسہ اردو سیل کی جانب سے ایک سرکاری سرکلر جاری کر کے خواہش مند افسران اور عملوں کے نام مدعو کئے جاتے ہیں۔

☆اردو سرٹیفکیٹ کورس :

محکمۂ النسہ اردو سیل کی اردو تربیتی اسکیم کے تحت چلائے جا رہے اردو سرٹیفکیٹ کورس کے تحت ہر سال چار ماہ کی اردو سرٹیفکیٹ کلاس کا اہتمام کیا جاتا ہے جس کا مقصد دلّی سرکار اور اس کے تحت کام کر رہے مختلف محکموں/ دفاتر، زیرِ انتظام شعبوں میں اردو زبان کی دلچسپی رکھنے والے افسران اور عملوں کو اردو زبان سکھانا ہے۔ ان کلاسوں میں مختلف مراتب اور درجات کے افسران اور عملے شریک ہوتے ہیں۔ مستقل نوعیت کی ان کلاسوں کے علاوہ آئندہ اس سلسلے میں مزید نئی کلاسیں بھی شروع کی جانی ہیں جو سال بہ سال بڑے بڑے اور اہم سرکاری دفاتر میں منعقد کی جائیں گی۔ ان کلاسوں کا مقصد سرکاری محکموں اور دفاتر میں کام کرنے والے زیادہ سے زیادہ افراد کو اردو زبان کی واقفیت اور لیاقت سے بہرہ ور کرنا ہے۔ اس سلسلے میں کئی محکموں کے افسران

www.taemeernews.com

اور عملوں نے اپنی خدمات فراہم کرنے کی پیشکش کی ہے۔

☆ایڈوانس اردو کورس:

محکمۂ السنہ اردو سیل کے سرٹیفکیٹ کورس کے ذریعہ اردو زبان لکھنے پڑھنے کی ابتدائی مہارت حاصل کرنے والے سرکاری افسران اور عملوں کو زبان کی مزید مہارت اور مشق کے لئے چھ ماہ کی مدت پر مشتمل ایک ایڈوانس اردو کورس بھی منعقد کیا جاتا ہے۔ جس میں روزمرہ اور دفتری زبان کی لیاقت کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی مختلف اصناف، ان سے متعلق رموز و نکات اور اردو تہذیب و ثقافت کی معلومات فراہم کرائی جاتی ہیں۔

☆اردو مضمون نویسی /خوش نویسی مقابلہ:

دلی سرکار کے مختلف محکموں/ دفاتر کے اردو زبان جاننے والے افسران اور عملوں کی اردو زبان سے دلچسپی کو برقرار رکھنے اور انھیں اردو لکھنے پڑھنے کی زیادہ سے زیادہ مشق کرانے اور حوصلہ افزائی کے مقصد سے اردو سیل کی جانب سے افسران اور عملوں کی علمی لیاقت اور عہدوں کی بنیاد پر مختلف زمروں کے مقابلے منعقد کئے جاتے ہیں۔ ان مقابلوں میں اوّل، دوم، سوم اور حوصلہ افزا مقام حاصل کرنے والے افراد کو انعامات، اسناد اور مومنٹو وغیرہ سے نوازا جاتا ہے۔

☆اردو ریفریشر کورس /ورکشاپ:

محکمۂ السنہ کے اردو سیل کی اردو تربیتی اسکیم کے تحت اردو زبان کی واقفیت رکھنے والے سرکاری افسران اور عملوں میں اردو زبان کی مطلوبہ مہارت اور لیاقت پیدا کرنے، ضروری اور لازمی حد تک اردو سے متعلق دفتری امور کی انجام دہی کو ممکن بنانے کے لئے ہر سال ایک اردو ریفریشر کورس/ ورکشاپ کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ جس میں جامعات اور سرکاری محکموں سے مدعو مختلف ماہرینِ اردو زبان کے ذریعہ سرکاری مراسلت اور اردو تحریر و املا سے متعلق ضروری اور نئی معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔

☆سمینار /سمپوزیم کا انعقاد:

محکمۂ السنہ اردو سیل کی جانب سے مالی سال 03-2002 کے اضافی بجٹ میں پہلی مرتبہ دو روزہ سمینار/ سمپوزیم کی منظوری حاصل ہوئی جو آئندہ برسوں میں بھی منعقد کیا جاتا رہے گا۔ اس اسکیم کے تحت "اردو زبان کا فروغ: جہات اور امکانات" کے عنوان سے منعقد کئے گئے سمینار/ سمپوزیم کا مقصد اردو سے متعلق مختلف شعبہ ہائے علوم و فنون میں اردو زبان کے فروغ اور ترویج و اشاعت کے امکانات کی جانب ماہرینِ علم و دانش کی توجہ مبذول کرانا ہے۔

●●●

www.taemeernews.com

(دلّی گزٹ غیر معمولی کے حصہ 4 میں اشاعت کے لیے)

قومی راجدھانی خطہ دلّی سرکار

(محکمۂ قانون، انصاف وقانونی معاملات)

8ویں منزل، سی ونگ، دلّی سکریٹریٹ، نئی دلّی۔110002

نمبر ایف 14 (33) ایل.اے 2000-03/1099 مورخہ 2/جولائی 2003ء

اطلاع نامہ (نوٹیفکیشن)

نمبر ایف 14 (33)/ایل.اے 03-2000 قومی راجدھانی خطہ دلّی کی مجلس قانون ساز (لجسلیٹو اسمبلی) کے درج ذیل قانون (ایکٹ) کو 13/جون 2003ء کو صدر جمہوریہ ہند کی منظوری حاصل ہوئی اور اب اسے عام اطلاع کے لیے شائع کیا جارہا ہے۔

''دلّی سرکاری زبان قانون 2000 (2003 کا دلّی قانون نمبر 8)

(جیسا کہ قومی راجدھانی خطہ دلّی کی مجلس قانون ساز نے 3/اپریل 2000ء کو منظور کیا)

قومی راجدھانی خطہ دلّی کے سرکاری مقاصد اور دوسرے معاملات میں استعمال کے لیے ہندی کو دیوناگری رسم الخط میں پہلی سرکاری زبان کی حیثیت سے اور پنجابی کو گورمکھی رسم الخط میں اور اردو کو فارسی رسم الخط میں دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے نافذ کرنے کی خاطر ایک قانون۔

قومی راجدھانی خطہ دلّی کی مجلس قانون ساز سے جمہوریۂ ہند کے اکیاونویں سال میں اسے درج ذیل طور پر قانونی شکل دی جائے۔

مختصر عنوان، حدود اور نفاذ:-

1۔(1) اس قانون کو دلّی سرکاری زبان قانون 2000ء کہا جائے گا۔

(2) یہ پورے قومی راجدھانی خطہ دلّی میں نافذ ہوگا۔

(3) یہ اُس تاریخ سے نافذ ہوگا جو سرکار اطلاع نامہ کے ذریعہ سرکاری گزٹ میں مشتہر کرے۔

تشریح:-

2۔اس قانون میں جب تک سیاق وسباق سے کچھ اور مراد نہ ہو۔

(الف) 'دلّی' سے مراد قومی راجدھانی خطہ دلّی ہے۔

(ب) 'سرکار' سے مراد قومی راجدھانی خطہ دلّی سرکار ہے۔

(ج) 'مجلس قانون ساز' سے مراد قومی راجدھانی خطہ دلّی کی مجلس قانون ساز ہے۔

www.taemeernews.com

ہندی دلّی کی سرکاری زبان:—

3۔ ہندی دیوناگری رسم الخط میں اُس تاریخ سے دلّی کی سرکاری زبان ہوگی جو سرکار اِس بارے میں اطلاع نامہ کے ذریعہ سرکاری گزٹ میں مقرر کرے۔

شرط یہ ہے کہ انگریزی زبان کا استعمال دلّی میں ان انتظامی اور قانونی مقاصد کے لیے جاری رہے گا جن کے لیے اس قانون کے نفاذ سے پہلے سرکاری السنہ قانون 1963 (1963 کا 19) کی دفعہ 3 میں درج قراردادوں کے مطابق استعمال کی جارہی تھی۔

شرط یہ بھی ہے کہ مجلس قانون ساز میں پیش کیے گئے کسی بھی بل یا پاس کیے گئے کسی قانون یا دلّی کے لیفٹیننٹ گورنر کی طرف سے نافذ کیے گئے کسی آرڈیننس یا کسی حکم، قاعدہ، ضابطہ جو پارلیمنٹ یا مجلس قانون ساز کے بنائے ہوئے کسی قانون کے تحت جاری کیا گیا ہو یا کوئی اور ریاستی قانون جس کا دلّی میں اطلاق ہو اور جو دلّی کے لیفٹیننٹ گورنر کے اختیارات کے تحت سرکاری گزٹ میں شائع ہوا ہو، اس قانون کے تحت اُن کا انگریزی، پنجابی اور اُردو زبانوں میں ترجمہ مستند متن سمجھا جائے گا۔

پنجابی اور اردو دلّی کی دوسری سرکاری زبانیں:—

4۔ پنجابی گورمکھی رسم الخط میں اور اردو اردو رسم الخط میں درج ذیل مقاصد کے لیے دلّی کی دوسری سرکاری زبانیں ہوں گی:

(الف) قومی راجدھانی خطہ دلّی کے سبھی دفتروں میں درخواستوں اور عرضیوں کی اردو یا پنجابی میں وصولی اور اسی زبان میں اس کا جواب۔

(ب) اہم سرکاری قوانین، ضوابط اور گزٹ اطلاع ناموں کے ترجموں کی اردو اور پنجابی میں بھی اشاعت۔

(ج) سرکاری عمارتوں، سرکاری دفتروں اور سڑکوں وغیرہ کے سائن بورڈ اردو اور پنجابی میں بھی لکھے جائیں گے۔

(د) اخبارات میں اہم سرکاری اشتہارات کی اردو اور پنجابی میں بھی اشاعت۔

(ہ) مجلس قانون ساز کی کارروائی جہاں ضرورت ہو ساتھ ساتھ اردو اور پنجابی میں بھی محفوظ اور جاری کی جائے گی۔

www.taemeernews.com

اعداد کی شکل:—

5۔ دلّی کے سرکاری مقاصد کے لیے استعمال کئے جانے والے اعداد کی شکل ہندوستانی اعداد کی بین الاقوامی شکل کے مطابق ہوگی۔

قواعد بنانے کا اختیار:—

6۔(1) سرکار اپنے گزٹ میں اطلاع نامے کے ذریعہ اس قانون کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے قواعد بنا سکتی ہے۔

(2) خاص طور سے اور مذکورہ بالا اختیارات کی عمومیت کو متاثر کئے بغیر ایسے قواعد میں درج ذیل سبھی یا کچھ معاملوں کو ملحوظ رکھا جائے گا۔

(الف) بلوں وغیرہ کے ہندی زبان میں اصل متن کے انگریزی، پنجابی اور اردو زبان میں ترجمہ کا طریقہ

(ب) کوئی اور معاملہ جس کی ضرورت ہو اور جو مقرر کیا جائے۔

(3) اس قانون کے تحت جو بھی قواعد بنائے جائیں گے، وہ بنائے جانے کے بعد جلد از جلد مجلس قانون ساز کے ایوان میں پیش کئے جائیں گے جبکہ اس کا سیشن چل رہا ہو تو اس کے تیس دن کے اندر، یہ مدت ایک سیشن کی بھی ہو سکتی ہے یا یکے بعد دیگرے دو یا اس سے زائد سیشن کی بھی اور اگر مذکورہ کسی سیشن کے ختم ہونے سے پہلے ایوان قواعد میں کوئی ترمیم کرتا ہے یا قواعد بنائے جانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تو قواعد کا نفاذ ترمیم شدہ صورت ہی میں ہوگا یا نہیں ہوگا، جیسی بھی صورتِ حال ہو۔ اس طرح کی کوئی ترمیم یا تنسیخ اس سے پہلے ان قواعد پر کئے گئے عمل درآمد کو متاثر نہیں کرے گی۔

دستخط

(پی ایس پرمار)

ڈپٹی سکریٹری (قانون، انصاف و قانونی معاملات)

www.taemeernews.com

(دلّی گزٹ غیر معمولی کے چوتھے حصہ میں اشاعت کے لیے)

قومی راجدھانی خطّہ دلّی سرکار

(محکمہ السنہ)

نمبر ایف 7(9)97/السنہ/254-240 مورخہ 14/جنوری 2004ء

اطلاع نامہ

نمبر ایف 7(9)97-السنہ(i) دلّی سرکاری زبان قانون 2000ء (2003 کا دلّی قانون 8) کی دفعہ ا کی ضمنی دفعہ (3) سے حاصل اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے قومی راجدھانی خطّہ دلّی کے لیفٹیننٹ گورنر مذکورہ قانون کے نفاذ کے لیے 26/جنوری 2004ء کی تاریخ مقرر کرتے ہیں۔

نمبر ایف 7(9)97-السنہ(ii) دلّی سرکاری زبان قانون 2000ء (2003 کا دلّی قانون 8) کی دفعہ 3 سے حاصل اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے قومی راجدھانی خطّہ دلّی کے لیفٹیننٹ گورنر دیوناگری رسم خط میں ہندی کو قومی راجدھانی خطّہ دلّی کی سرکاری زبان بنائے جانے کے لیے 26/جنوری 2004ء کی تاریخ مقرر کرتے ہیں۔

قومی راجدھانی خطّہ دلّی کے گورنر کے نام اور ان کے حکم سے

(نیتا بالی)

سکریٹری (فن، ثقافت و السنہ)

www.taemeernews.com

آئین ہند میں درج لسانی اقلیتوں کے مفادات سے متعلق دفعات

ثقافتی اور تعلیمی حقوق

''29۔(1) بھارت کے علاقہ میں یا اس کے کسی حصہ میں رہنے والے شہریوں کے کسی طبقہ کو جس کی اپنی الگ جداگانہ زبان، رسم الخط یا ثقافت ہو اس کو محفوظ رکھنے کا حق ہوگا۔''

''(2) کسی شہری کو ایسے تعلیمی ادارہ میں جس کو مملکت چلاتی ہو یا جس کو مملکتی فنڈ سے امداد ملتی ہو داخلہ دینے سے محض مذہب، نسل، ذات زبان یا ان میں سے کسی کی بنا پر انکار نہیں کیا جائے گا۔''

اقلیتیوں کو تعلیمی ادارے قائم کرنے اور اُن کا انتظام کرنے کا حق

''30(1) تمام اقلیتوں کو خواہ وہ مذہب کی بنا پر ہوں یا زبان کی، اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور اُن کا انتظام کرنے کا حق ہوگا۔

(1۔الف) فقرہ (1) میں محولہ کسی اقلیت کے قائم کردہ اور زیر انتظام کسی تعلیمی ادارے کی کسی جائداد کے لازمی حصول کی نسبت کوئی قانون بناتے وقت مملکت اس امر کو یقینی بنائے گی کہ ایسی جائداد کے حصول کے لیے ایسے قانون کی رو سے مقررہ یا اُس کے تحت تعین شدہ رقم ایسی ہو جس سے اس ضمن کے تحت ایسا حق، جس کی ضمانت دی گئی، محدود یا ساقط نہ ہو جائے۔

(2) مملکت تعلیمی اداروں کو امداد عطا کرنے میں کسی تعلیمی ادارے کے خلاف اس بنا پر امتیاز نہ برتے گی کہ وہ کسی اقلیت کے زیر انتظام ہے خواہ وہ اقلیت مذہب کی بنا پر ہو یا زبان کی۔''

زبان جو پارلیمنٹ میں استعمال ہوگی

''120۔(1) حصہ 17 میں کسی امر کے باوجود لیکن دفعہ 348 کی توضیعات کے تابع پارلیمنٹ میں کاروبار ہندی یا انگریزی میں ہوگا۔

بشرطیکہ... راجیہ سبھا کا میر مجلس یا لوک سبھا کا اسپیکر یا وہ شخص جو اس حیثیت سے کام کر رہا ہو، جیسی کہ صورت ہو، کسی ایسے رکن کو جو اپنے مطلب کا اظہار پورے طور پر ہندی یا انگریزی میں نہ کر سکتا ہو ایوان کو اس کی اپنی مادری زبان میں خطاب کرنے کی اجازت دے سکے گا۔''

''(2) بجز اس کے کہ پارلیمنٹ قانون کے ذریعہ اور طور پر توضیع کرے اس آئین کی تاریخ نفاذ سے پندرہ سال کی مدت منقضی ہونے کے بعد یہ دفعہ اس طرح نافذ ہوگی گویا کہ الفاظ ''یا انگریزی میں'' اس سے حذف کیے گئے تھے۔''

زبان جو مجلس قانون ساز میں استعمال ہوگی

''210۔(1) حصہ 17 میں کسی امر کے باوجود لیکن دفعہ 348 کی توضیعات کے تابع کسی ریاست کی مجلس قانون ساز میں کاروبار اس ریاست کی سرکاری زبان یا زبانوں میں یا ہندی میں یا انگریزی میں ہوگا۔

بشرطیکہ قانون ساز اسمبلی کا اسپیکر یا قانون ساز کونسل کا میر مجلس یا وہ شخص جو اس حیثیت سے کام کر رہا ہو، جیسی کہ صورت ہو، کسی ایسے رکن کو جو اپنے مطلب کا اظہار پورے طور پر مذکورہ بالا زبانوں میں سے کسی زبان میں نہ کر سکتا ہو، ایوان کو اس کی اپنی مادری زبان میں خطاب کرنے کی اجازت دے سکے گا۔''

www.taemeernews.com

"(2) بجز اس کے کہ ریاست کی مجلس قانون کے ذریعہ دیگر طور پر توضیع کرے یہ دفعہ اس آئین کی تاریخ نفاذ سے پندرہ سال کی مدت منقضی ہو جانے کے بعد اس طرح نافذ رہے گی گویا کہ الفاظ "یا انگریزی میں" اس سے حذف کیے گیے تھے۔ بشرطیکہ ہماچل پردیش، منی پوری، میگھالیہ اور تری پورہ کی ریاستوں کی مجالس قانون ساز کے تعلق سے یہ فقرہ اس طرح نافذ رہے گا گویا کہ الفاظ "پندرہ سال" کے بجائے جو اس آئین میں آئے ہیں الفاظ "پچیس سال" قائم کیے گیے تھے۔ مزید شرط یہ کہ اروناچل پردیش، گوا اور میزورم ریاستوں کی مجالس قانون ساز کے تعلق سے یہ فقرہ اس طرح نافذ رہے گا گویا کہ الفاظ "پندرہ سال" کے بجائے جو اس آئین میں آئے ہیں الفاظ "چالیس سال" قائم کیے گئے تھے۔"

ریاست کی سرکاری زبان یا زبانیں

"345۔ دفعات 346 اور 347 کی توضیعات کے تابع ریاست کی مجلس قانون ساز قانون کے ذریعہ اس ریاست میں استعمال ہونے والی کسی ایک یا زیادہ زبانوں یا ہندی کو اس زبان یا ان زبانوں کی حیثیت سے اختیار کر سکے گی جس کا یا جن کا اس ریاست کی تمام سرکاری اغراض یا ان میں سے کسی غرض کے لیے استعمال کیا جاتا ہو۔ بشرطیکہ جب تک اس ریاست کی مجلس قانون ساز قانون کے ذریعہ دیگر طور پر توضیع نہ کرے انگریزی زبان ان سرکاری اغراض کے لیے اس ریاست کے اندر استعمال ہوتی رہے گی جن کے لیے وہ اس آئین کی تاریخ نفاذ کے عین قبل استعمال ہوتی تھی۔"

اُس زبان کے متعلق خصوصی توضیع جسے ریاست کی آبادی کا ایک حصہ بولتا ہو

"347۔ اس بارے میں مطالبہ کیے جانے پر صدر، اگر وہ مطمئن ہو کہ کسی ریاست کی آبادی سے قابل لحاظ تناسب کی خواہش ہے کہ وہ ریاست کی کسی زبان کے استعمال کو جس کو وہ بولتے ہیں، تسلیم کرے تو ہدایت کر سکے گا کہ ایسی زبان بھی اس ریاست بھر میں یا اس کے کسی حصہ میں اس غرض کے لیے، جس کی وہ صراحت کرے، سرکاری طور پر تسلیم کر لی جائے۔"

شکایتوں کے ازالہ کی درخواستوں میں استعمال ہونے والی زبان

"350۔ ہر شخص کو کسی شکایت کے ازالہ کے لیے یونین یا کسی ریاست کے کسی عہدہ دار یا حاکم کو ان زبانوں میں سے کسی زبان میں جو یونین یا اس ریاست میں، جیسی کہ صورت ہو، استعمال ہوں عرض داشت پیش کرنے کا حق ہوگا۔"

ابتدائی درجے میں مادری زبان میں تعلیم دینے کی سہولتیں

"350 الف۔ ہر ریاست اور اُس ریاست کے اندر ہر مقامی حاکم کی کوشش ہوگی کہ لسانی اقلیتی زمروں سے تعلق رکھنے والے بچوں کو تعلیم کے ابتدائی درجے میں مادری زبان میں تعلیم دینے کی کافی سہولتیں مہیا کرے اور صدر کسی ریاست کو ایسی ہدایتیں اجرا کر سکے گا جو ایسی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے وہ ضروری یا مناسب سمجھے۔"

لسانی اقلیتوں کے لیے خاص عہدیدار

350 ب۔(1) لسانی اقلیتوں کے لیے ایک خاص عہدہ دار ہوگا جس کا تقرر صدر کرے گا۔

(2) اس خاص عہدے دار کا فرض ہوگا کہ اس آئین کے تحت لسانی اقلیتوں کے لیے دیے ہوئے تحفظات کے متعلق سب امور کی تفتیش کرے اور صدر کو ان امور پر ایسے وقفوں سے، جن کی صدر ہدایت دے، رپورٹ کرے اور صدر ایسی ساری رپورٹوں کو پارلیمنٹ کے ہر ایوان میں پیش کروائے گا اور متعلقہ ریاستوں کی حکومتوں کو بھجوائے گا۔

بھارت کا آئین (قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان)

www.taemeernews.com

زبان کی توقیر، ملک کی توقیر

www.taemeernews.com

उर्दू ज़बान का फरोग़: जिहात व इमकानात

URDU ZABAN KA FAROGH : JEHAT-O-IMKANAT

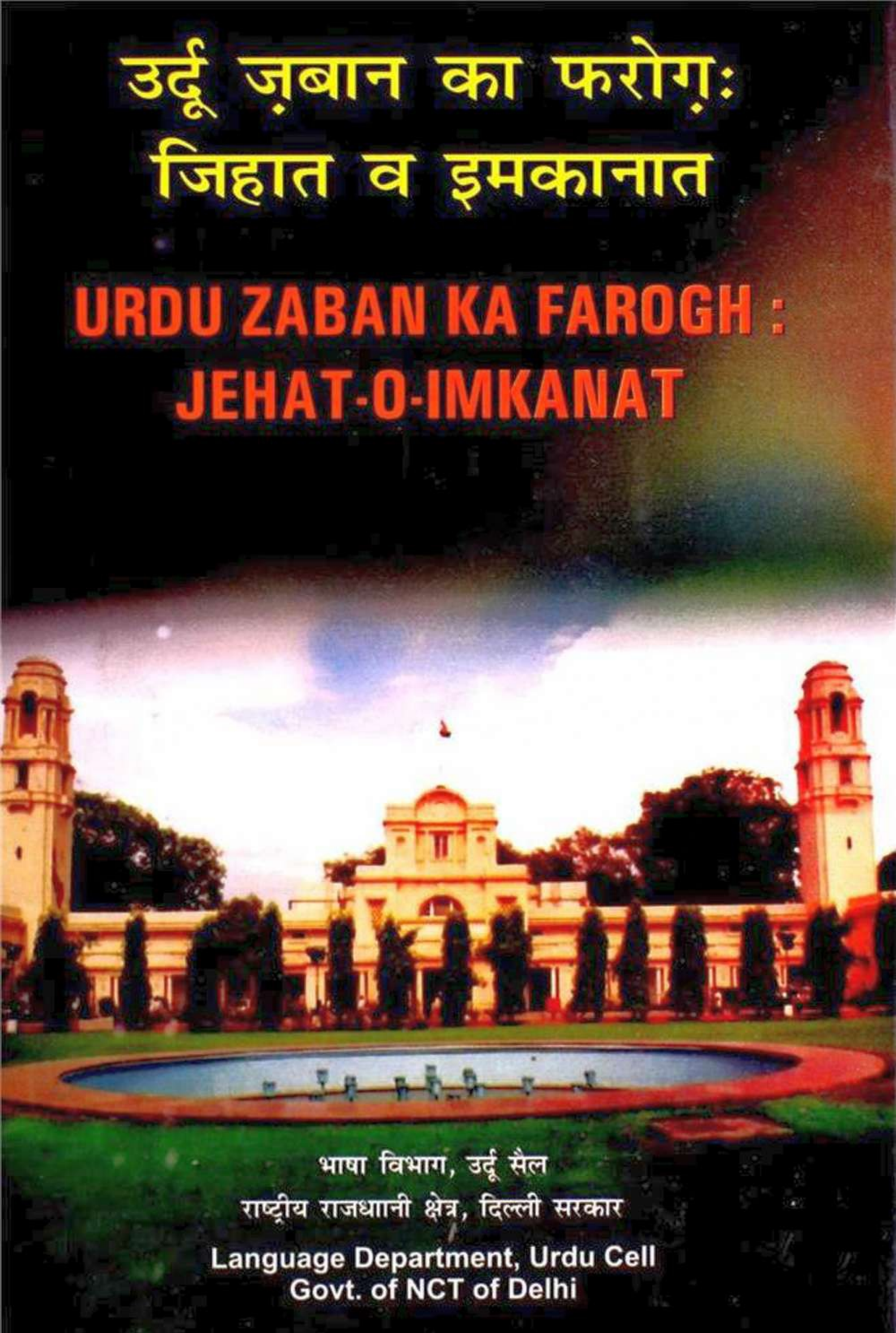

भाषा विभाग, उर्दू सैल

राष्ट्रीय राजधानी क्षेत्र, दिल्ली सरकार

Language Department, Urdu Cell

Govt. of NCT of Delhi